دفتر محاضرات علمیہ دار العلوم دیوبند

بابت سنہ ۱۴۱۵ھ

پہلا محاضرۂ علمیہ

بر موضوع

رد غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

فہرست مضامین

ہندوستان میں تحریک اہلِ حدیث کی ابتداء ـــــ ۳
تحریک اہلِ حدیث کا پس منظر ـــــ ۷
اہلِ حدیث نام کب سے شروع ہوا ـــــ ۱۰
درخواست برائے الاٹمنٹ بنام اہلِ حدیث ـــــ ۱۱
برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اہلِ حدیث نام کی الاٹمنٹ ـــــ ۱۳
کیا ان حضرات کا اہلِ حدیث نام صحیح ہے ـــــ ۱۴
پہلے اہلِ حدیث کن کو کہا جاتا تھا؟ ـــــ ۱۸
ان کا مناسب نام کیا ہوگا؟ ـــــ ۲۲
مولانا عبدالحق بنارسی ـــــ ۲۳
نواب صدیق حسن صاحب ـــــ ۲۴
نواب صاحب اور انگریز ـــــ ۲۶
مولانا نذیر حسن صاحب دہلوی ـــــ ۲۹
مولوی نذیر صاحب اور انگریز ـــــ ۳۰
مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی ـــــ ۳۱
مولانا محمد حسین صاحب اور انگریز ـــــ ۳۲

کاتب: محمد نسیم سیتاپوری شرافت منزل، خانقاہ، دیوبند ۹۲ء

ہندوستان میں تحریکِ اہل حدیث کی ابتداء

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ اٰلہ واصحابہ اجمعین :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق کہ تفترق امتی علیٰ ثلث وسبعین ملۃ " (ترجمہ) میری امت تہتر فرقوں پر تقسیم ہو جائے گی ۔

ہر دور میں اہل حق کے متوازی فرقے پیدا ہوتے رہے انھیں فرقوں میں یہ فرقہ اہل حدیث بھی ہے جس کی ابتدا ہندوستان میں ۱۲۴۶ھ کے بعد ہوئی ۔ اس سے قبل ہندوستان میں اس فرقہ کا نام ونشان تک نہ تھا ۔ مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

" خلاصۂ حال ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ ہے کہ جب سے یہاں اسلام آیا چونکہ اکثر لوگ بادشاہوں کے طریقے اور مذہب کو پسند کرتے ہیں ۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہ لوگ حنفی مذہب پر قائم رہے اور ہیں ۔ اور اسی مذہب کے عالم اور فاضل قاضی اور مفتی اور حاکم ہوتے رہے ہیں [1]

صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین صاحب متوفی ۱۲۸۹ھ اپنے رسالہ تحفۃ العرب والعجم میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

" مسکین قطب الدین مسلمان بھائیوں کی خدمات عالیات میں سلام پہنچانے کے

---

[1] ترجمان وہابیہ مصنفہ نواب صدیق صاحب صنا ،

بعد حدیث پاک النصح لکل مسلم کے مقتضاء سے مطابق التماس کرتا ہے کہ تخمیناً
چالیس بیالیس برس کا عرصہ ہوا کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل صاحب
اور مولانا عبدالحی صاحب ان حضرات کے ملک پنجاب کی طرف تشریف لے جانے کے بعد بعض
مفسدین مزاجوں کے خیال میں ائمہ دین متین کی تقلید کا کچھ انکار آیا تھا اور فقہا اور فقہ
کی طرف سے عناد کا تخم بالخصوص جناب حضرت ابوحنیفہؒ کی طرف سے ان کے دل میں جما تھا
منجملہ ان لوگوں کے جنھوں نے لامذہبی کی خوب خوب داد دے کر بہت سے مسلمانوں کو حضرت
سید احمد شہید کی خلافت کا مدعی بن کر بہکایا، اور فساد نو احداث مذہب کا پھیلایا تھا مولوی
عبدالحق بنارسی تھا۔ سو اس وقت پورب کے دین دار لوگوں نے بالخصوص سید احمد شہید
بریلوی کے خلفاء اور مریدوں نے حرمین شریفین کے علماء سے فتویٰ طلب کیے۔ چنانچہ وہاں
کے چاروں مذہب کے مفتیوں نے اور وہاں کے تمام دیگر علماء نے، جیسے شیخ عابد سندھی
مصنف طوالع الانوار حاشیہ درمختار نے لکھ دیا کہ ایسے لوگ گمراہ اور گمراہ کرنیوالے ہیں اور اس
فتوی پر اپنی اپنی مہریں ثبت فرمائیں۔ اس کے بعد اس فتویٰ پر کلکتہ وغیرہ کے تمام علماءُ
نے بالخصوص سید احمد بریلوی کے خلفاء حضرات نے اپنی اپنی مہریں کیں اور ایسے لوگوں
کی گمراہی پر اتفاق ہوگیا[1]

حضرت نواب قطب الدین صاحب رح کی اس عبارت سے یہی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس فرقہ جدیدہ
کی منظم شکل ۱۲۴۶ھ کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ کیوں کہ مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ نے حضرت سید صاحبؒ
کی خلافت کا دعویٰ کر کے اپنے نظریات کی اشاعت شروع کی تھی اور سید صاحب رح کی شہادت
۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔ نیز مولوی عبدالحق صاحب وغیرہ کے خلاف سیّد صاحب رح کے خلفاء نے علمائے
حرمین سے فتوی طلب کیا تھا۔ جو یقیناً حضرت سیّد صاحب رح کی شہادت کے بعد کا واقعہ ہے اور اس
کے بعد ہندوستان کے علماء نے بھی اس فرقہ کے خلاف فتوی دیا۔

ہندوستانی علماء کا یہ فتویٰ ۱۲۵۴ھ میں شائع ہوا۔ تنبیہ الضالین میں ہے:

---

[1] بحوالہ النجاۃ الکاملہ ص۲۱۴۔

"۱۲۵۴ھ میں اس فرقہ کے خلاف متعدد علماء نے سخت فتوی دیئے جن میں حضرت شاہ اسحاق صاحب رح دہلوی متوفی ۱۲۶۲ھ، مفتی صدر الدین صاحب رح خاں بہادر دہلوی متوفی ۱۲۸۵ھ، مولانا عبدالخالق صاحب رح متوفی ۱۲۶۱ھ (استاد و خسر مولوی سید نذیر حسین) خاص طور سے قابل ذکر ہیں"۔[1]

نواب قطب الدین صاحب فرماتے ہیں:

"۱۲۵۴ھ ایک ہزار دو سو چوّن میں ایک استفتاء مولوی اسحاق صاحب نواسہ و جانشین حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب" کے روبرو پیش کیا گیا، انھوں نے اس کے جواب میں تقلید امام معین کو واجب مخیر اور اس کے منکر کو ضال یعنی گمراہ لکھا پھر اس فتوی پر دیگر علماء شہر نے بھی کچھ عبارتیں لکھ کر اپنی اپنی مہریں ثبت کیں ۔۔۔ پھر یہ فتوی، فتوی حرمین شریفین کے ساتھ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے منظم کر کے چھاپا اور اس کا نام ۔۔۔ تنبیہ الضالین رکھا"۔[2]

اسی تنبیہ الضالین میں ہے:

"سو بانی اس فرقہ نو احداث کا عبدالحق بنارسی ہے جو چند روز سے بنارس میں رہتا ہے اور حضرت امیر المومنین (سید احمد شہید) نے ایسی ہی حرکات ناشائستہ کے باعث اپنی جماعت سے اس کو نکال دیا۔ اور علماء حرمین شریفین نے اس کے قتل کا فتوی لکھا مگر کسی طرح وہاں سے بھاگ کر بچ نکلا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے تئیں خلیفہ امیر المومنین کا مشہور کر کے لوگوں کو اپنے عقائد سے بندر بج مطلع کیا"۔[3]

نیز کتاب مذکور میں ہے:

"اگر حضرت امیر المومنین سید احمد رح اس زمانے میں ہوتے تو ان نئے مذہب والے

---

[1] تنبیہ الضالین صا۳۱، بحوالہ طائفہ منصورہ صنا۱۰۔

[2] تحفۃ العرب والعجم بحوالہ النجاۃ الکاملہ صـ۱۶ـ جلد ۲۔

[3] تنبیہ الضالین صـ۵ـ، بحوالہ انگریز اور اہل حدیث صـ۱۷ـ۔

مفسدوں، گمراہوں، غیر مقلدوں کا وہی حال کرتے جو ان کے پیشوا عبدالحق کا کیا تھا یعنی مردود کہتے اور نکلوا دیتے۔" [ا]

جناب نواب صدیق حسن صاحب رح جو غیر مقلدوں کے مایۂ ناز محقق ہیں بلکہ وہ لوگ انہیں پے نوور کا مجدد قرار دیتے ہیں [۲] ...... اپنی مشہور کتاب الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقد نبت فی هذا الزمان فرقة ذات سمعة ورياء تدعی لانفسها علم الحديث والقرآن والعمل بهما مع العلات فی كل شأن مع انها ليست فی شئ من اهل العلم والعمل والعرفان فيا لله العجب من ان يسمون انفسهم الموحدين والمخلصين وغيرهم بالمشركين وهم اشد الناس تعصبا وغلوا فی الدين" [۳]

یہ واضح رہے کہ نواب صاحب کے زمانے تک غیر مقلدین اپنے کو اہلحدیث کے بجائے موحدین کہتے تھے ۔۔۔ اہل حدیث کا لقب تو انھوں نے ۱۸۸۸ء میں اپنے لیے نامزد کرایا۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

غیر مقلد عالم مولوی محمد شاہ جہاں پوری متوفی ۱۳۳۸ھ جن کی کتاب "الارشاد الی سبیل الرشاد" مقلدوں کے یہاں بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے [۴] خود اپنے ہی فرقہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کچھ عرصے سے ہندوستان میں ایک ایسے غیر مانوس مذہب کے لوگ دیکھنے میں آرہے ہیں جس سے بالکل لوگ ناآشنا ہیں۔ پچھلے زمانے میں شاذ و نادر اس خیال کے لوگ کہیں ہوں تو ہوں مگر اس کثرت سے دیکھنے میں نہیں آئے۔ بلکہ ان کا نام بھی ابھی تھوڑے ہی دنوں میں سنا ہے۔ اپنے آپ کو تو وہ اہل حدیث یا محمدی کہتے ہیں مگر مخالف فریق میں ان کا نام غیر مقلد یا وہابی یا لامذہب لیا جاتا ہے۔" [۵]

[ا] تنبیہ الضالین صفحہ ۹ بحوالہ انگریز اور اہلحدیث۔
[۲] ملاحظہ ہو مقدمہ الحطہ صفحہ ۱۔
[۳] ؍؍ ؍؍ صفحہ ۱۵۳۔
[۴] ملاحظہ ہو تراجم علمائے اہل حدیث ہند صفحہ ۲۷۳۔
[۵] الارشاد الی سبیل الرشاد صفحہ ۱۳۔

تنبیہ الضالین میں ہے :

" بعضے کم علم لوگوں نے حضرت کی خبر شہادت کے بعد اپنی ناموری اور جاہلوں میں عزت بڑھانے کو اور دین کے پردے میں دنیا کمانے کو ایک گروہ اپنا علیحدہ مقرر کرلینے کو اس دین محمدی میں رخنہ ڈالنا شروع کردیا۔ سوائے سلمانوں یہ زمانہ فساد کا ہے اور یہ لوگ آخری زمانہ کے نائب دجال ہیں یعنی باطل کو حق کے ساتھ ملانے والے ایسے لوگ اس زمانہ میں بہت ظاہر ہوں گے یا یہ اصلاً روافض شیعہ ہیں سنیوں میں چھپے ہوئے دین میں فساد ڈالتے ہیں اور آہستہ آہستہ لوگوں کو بے دین کرتے ہیں ایسوں ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف کے تیرھویں سپارے نویں رکوع فرمایا ہے : الذین ینقضون عہد اللہ من بعد الخ ویفسدون فی الارض الخ[1]

تحریک اہل حدیث کا پس منظر

دنیا میں خلاف حق تحریکات ونظریات اور فرقے یوں ہی اتفاقاً منصۂ شہود پر ظاہر نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ان کے پس پردہ کچھ عزائم مقاصد مذہبی یا سیاسی جذبات نیز زیر پردہ چھپے ہوئے، بعض حضرات کا .... " دست پنہاں" ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس تحریک اہل حدیث کے پس منظر میں کون سے عوامل تھے۔ اس سلسلے میں اسی تحریک ہی کے رکن رکین، مربی وسرپرست جناب نواب صدیق حسن صاحب کی یہ گواہی شہادت اہل خانہ کے مترادف ہے۔ فرماتے ہیں :

" یہ آزادگی ہماری مذاہب جدیدہ سے (یعنی تحریک اہل حدیث' ناقل) عین مراد قانون انگلشیہ ہے۔"[2]

نیز فرماتے ہیں :

" فرماں روان بھوپال کو ہمیشہ آزادگی' مذہب (یعنی عدم تقلید) میں کوشش رہی ہے جو خاص منشا گورنمنٹ انڈیا کا ہے۔"[3]

---

[1] بحوالہ غیر مقلدین اپنے اکابر کی نظر میں ص۲۹ ، [2] ترجمان وہابیہ ص۲ مصنفہ نواب صاحب ، [3] ؍؍ ص۳۳ ۔

اسی تحریک اہل حدیث کی ایک شاخ غربا اہل حدیث ہے جس کے بارے میں غیر مقلد محمد مبارک صاحب لکھتے ہیں:

"جماعت غربا اہل حدیث کی بنیاد محدثین کی مخالفت پر رکھی گئی تھی۔ صرف یہی مقصد نہیں بلکہ "تحریک مجاہدین" یعنی سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت کرکے انگریز کو خوش کرنے کا مقصد پنہا تھا۔"[1]

غیر مقلدوں کے شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین کے شاگرد خاص مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی جو اپنے زمانے میں "وکیل اہل حدیث" کہلاتے تھے۔ بڑے طمطراق سے رقم طراز ہیں کہ:

"اس گروہ اہل حدیث کے خیر خواہ وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قوی دلیل ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے زیر سایہ رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں۔"[2]

میاں نذیر حسین کے شاگرد رشید مولوی تلطف حسین فرماتے ہیں کہ:

"انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لیے خدا کی رحمت ہے۔"[3]

غیر مقلد عالم مولوی عبد الرحیم عظیم آبادی اپنی کتاب الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور میں لکھتے ہیں کہ:

"خاص کر فرقہ اہل حدیث کے لیے تو کسی اسلامی سلطنت میں بھی یہ آزادی مذہبی نصیب نہیں جو برٹش حکومت میں حاصل ہے۔"[4]

ع ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

آئندہ صفحات میں یہ وضاحت آرہی ہے کہ اس فرقے کا اہل حدیث نام بھی انھیں انگریز آقاؤں کا رہین کرم ہے۔ نیز اس فرقے کی تمام مرکزی شخصیات کے حکومت برطانیہ سے خصوصی مراسم بھی اس رازِ دروں کو واشگاف کرتے ہیں۔ ع

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری کا

---

[1] علماء احناف اور تحریک مجاہدین ص۴۵۔
[2] الحیاۃ بعد الممات ص۹۳۔
[3] الحیاۃ بعد الممات ص۹۳
[4] الدر المنثور بحوالہ رسالہ اہل حدیث ص۱۸۔

انگریزی عنایات بیکراں کے مورد خاص ہمیشہ ہی رہے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کو انگریزی جہاد کرنے کے خلاف رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" لکھنے پر جاگیر ملی۔

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں کہ:

"معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضہ میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی" لے سیرت ثنائی میں ہے کہ:

"اس کتاب پر مولوی محمد حسین بٹالوی انعام سے بھی سرفراز ہوئے۔ جماعت اہلحدیث کو فرقہ کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے اور یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقہ میں وفاداری کی خوب بو پیدا کی ہے" ٢ہ

حکومت انگلشیہ کی طرف سے خطابات کچھ خاص خدمات کے صلہ ہی میں ملا کرتے تھے جن سے بالعموم یہی حضرات نوازے جاتے تھے۔ حکومت انگریزی کی طرف سے نواب صدیق احمد کی اہلیہ رئیسہ بھوپال کو یہ مژدہ جانفزا ملتا ہے کہ "اس نوید مسرت افزا سے آپ کو اطلاع دی گئی ہے کہ گورنمنٹ انگلشیہ سے دیا جانا خطاب نوابی و خلعت نواب صدیق حسن خاں بہادر شوہر مشفقہ کو منظور ہوا ہے" ٣ہ

مولوی عبدالرحیم عظیم آبادی نے اپنی کتاب "الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور" میں "ان غیر مقلد علماء کی فہرست ذکر کی ہے جن کو انگریزی حکومت کی طرف سے شمس العلماء و خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ ایک نظر اس فہرست پہ بھی ڈالتے چلیں۔

شمس العلماء حضرت مولانا محمد سعید قدس سرہٗ ساکن مغل پور شہر پٹنہ۔

شمس العلماء جناب حضرت مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن محلہ صادق پور شہر پٹنہ۔

شمس العلماء برادرم عزیز مولوی عبدالرؤف مرحوم و مغفور ساکن محلہ صادق پور پٹنہ۔

لہ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۱۲۔ ٣ہ مآثر صدیقی ص۹۱ ج۲۔

٢ہ سیرت ثنائی ص۳۷۲ بحوالہ اہل حدیث اور انگریز ص۵۷۔

شمس العلماء مولوی امجد علی صاحب ایم، اے پروفیسر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد ساکن صادق پور (پٹنہ)

شمس العلماء جناب حضرت مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی ساکن سورج گڑھ (مونگیر)

مولوی محمد یوسف جعفری (رنجور)

خاں بہادر جناب قاضی سید محمد اجمل صاحب مرحوم ساکن قصبہ باڑہ (پٹنہ)

خان بہادر جناب قاضی مولوی فرزند احمد صاحب ساکن گیا۔[1]

یہ صرف ان خطاب یافتہ حضرات کی فہرست ہے جو ایک صوبہ بہار سے تعلق رکھتے تھے

اہل حدیث نام کب سے شروع ہوا

اس فرقے کے لوگ پہلے پہل کسی خاص نام کے ساتھ منسوب نہ تھے، بعد میں یہ لوگ اپنے آپ کو محمدی یا موحد کہنے لگے دوسرے لوگ ان کو وہابی کہتے تھے۔

مولوی اسلم جیراجپوری جو اہل حدیث کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"پہلے اس جماعت نے اپنا کوئی خاص نام نہیں رکھا تھا۔ مولانا شہید کے بعد جب مخالفوں نے ان کو بدنام کرنے کے لیے وھابی کہنا شروع کیا تو وہ اپنے آپ کو محمدی کہنے لگے۔ پھر اس کو چھوڑ کر اہل حدیث کا لقب اختیار کیا جو آج تک چلا آرہا ہے"[2]

جس طرح بعض دفع بچۂ نومولود کا ابتداءً کچھ نام نہیں رکھا جاتا، چند دن کے بعد کوئی نام رکھ دیا جاتا ہے اسی طرح اس فرقہ کی ابتدا میں اس کا کوئی نام نہیں تھا پھر کچھ دنوں کے بعد محمدی یا موحد کے نام سے موسوم ہوئے۔ پھر مزید دجل وفریب کے خیال سے اپنا نام اہل حدیث رکھ لیا اور باقاعدہ انگریز گورنمنٹ سے اس کی سند اور اجازت بھی حاصل کرلی۔ سچ ہے ؎

شاہد دل ربائے من می کند از برائے من
نقش ونگار ورنگ وبو لحہ بہ لحہ نو بنو

میاں نذیر حسین صاحب کے خسر مولانا عبدالخالق صاحب۔ المتوفی ۱۲۶۱ھ کے زمانے تک ان

---

[1] الدرالمنثور ص۲ بحوالہ رسائل اہل حدیث ص۲۲، [2] نوادرات ص۳۴۲ بحوالہ طائفہ منصورہ ص۱۰۱۔

لوگوں نے ابھی اپنا نام اہل حدیث نہیں اختیار کیا تھا بلکہ خود کو محمدی کہتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"یہ لوگ اپنے آپ کو محمدی اور دوسرے مذاہب والوں کو ناقص محمدی اور بدعتی کہتے ہیں[۱]"۔ ــــــ نیز لکھتے ہیں:

"لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہم محمدی ہیں اور حقیقت میں محمدیوں کے خلاف ہیں[۲]"۔

مولوی محمد حسین صاحب نے جو غیر مقلدین کے وکیل اعظم تھے۔ لفظ وہابی کی منسوخی اور اہلحدیث نام کی الاٹمنٹ کے لیے انگریز بہادر کے حضور ایک درخواست پیش کی جس میں انگریز سرکار کیلیے غیر مقلدین کی من حیث الجماعت وفاداری، خیر خواہی اور نمک حلالی کے سلسلے میں اپنی جماعت کی نمایاں خدمات کا ذکر کیا۔ اور متعدد نازک مواقع میں اپنی بہی خواہی کی نشان دہی کی اور اس درخواست کے اخیر میں التجا کی کہ لفظ وہابی کو منسوخ کر کے ہمارے فرقے کے لیے اہل حدیث نام الاٹ کیا جائے۔

ذیل میں اس درخواست کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کے مضرات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے:۔

ترجمہ درخواست برائے الاٹمنٹ بنام اہل حدیث

ومنسوخی لفظِ وہابی، اشاعت السنۃ آفس لاہور

ازجانب ابوسعید محمد حسین لاہوری۔ ایڈیٹر۔ اشاعت السنہ و وکیل اہل حدیث ہند

"بخدمت جناب سکریٹری گورنمنٹ، میں آپ کی خدمت میں سطورِ ذیل پیش کرنے کی اجازت اور معافی کا خواستگار ہوں۔ ۱۸۸۶ء میں، میں نے ایک مضمون اپنے ماہواری رسالہ اشاعت السنہ میں شائع کیا تھا جس میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ لفظ وہابی جس کو عموماً باغی و نمک حرام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کا استعمال مسلمانان ہندوستان کے اس گروہ کے حق میں جو اہل حدیث کہلاتے ہیں اور وہ ہمیشہ

---

[۱] تنبیہ الضالین ص۳۲ بحوالہ طائفہ منصورہ ص۱۰؛

[۲] " " " ص۱۳۰ " " "

سے سرکار انگریز کے نمک حلال اور خیر خواہ رہے ہیں اور یہ بات (سرکار کی وفاداری اور نمک حلالی) بارہا ثابت ہو چکی ہے اور سرکاری خط و کتابت میں تسلیم کی جاچکی ہے مناسب نہیں (خط کشیدہ جملے خاص طور پر قابلِ غور ہیں)
بنا بریں اس فرقہ کے لوگ اپنے حق میں اس لفظ کے استعمال پر سخت اعتراض کرتے ہیں اور کمالِ ادب و انکساری کے ساتھ گورنمنٹ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ (ہماری وفاداری، جانثاری او نمک حلالی کے پیش نظر) سرکاری طور پر اس لفظِ وہابی کو منسوخ کر کے اس لفظ کے استعمال سے ممانعت کا حکم نافذ کرے اور ان کو اہل حدیث کے نام سے مخاطب کیا جاوے"
اس مضمون کی ایک کاپی بذریعہ عرض داشت میں (محمد حسین بٹالوی) نے پنجاب گورنمنٹ میں پیش کی اور اس میں یہ درخواست کی:
"کہ گورنمنٹ اس مضمون کی طرف توجہ فرماوے اور گورنمنٹ ہند کو بھی اس پر متوجہ فرماوے اور اس فرقے کے حق میں استعمال لفظ وہابی سرکاری خط و کتابت میں موقوف کیا جاوے اور اہل حدیث کے نام سے مخاطب کیا جاوے" اس درخواست کی تائید کے لیے اور اس امر کی تصدیق کے لیے یہ درخواست کل ممبران اہل حدیث پنجاب و ہندوستان کی طرف سے ہے (پنجاب ہندوستان کے تمام غیر مقلد علما، یہ درخواست پیش کرنے میں برابر کے شریک ہیں) اور ایڈیٹر اشاعت السنہ ان سب کی طرف سے وکیل ہے۔ میں (محمد حسین بٹالوی) نے چند قطعات محضر نامہ گورنمنٹ پنجاب میں پیش کیا جن پر فرقہ اہل حدیث تمام صوبہ جات ہندوستان کے دستخط ثبت ہیں اور ان میں اس درخواست کی بڑے زور سے تائید پائی جاتی ہے۔ چنانچہ آنریبل سر چارلس ایچی سن صاحب بہادر جو اس وقت پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر تھے گورنمنٹ کو اس درخواست کی طرف توجہ دلا کر اس درخواست کو باجازت گورنمنٹ ہند منظور فرمائیں اور اس استعمال لفظِ وہابی کی مخالفت اور اجراء نام اہلحدیث کا حکم پنجاب میں نافذ فرمایا جاوے میں ہوں آپکا نہایت ہی فرمانبردار خادم" ابو سعید محمد حسین ایڈیٹر اشاعت السنہ
(ص ۲۴ تا ص ۲۶ شمارہ ۲ جلد ۱۱)

برٹش گورنمنٹ کی طرف سے بٹالوی صاحب کو اہل حدیث کے نام کی الاٹمنٹ کی اطلاع

مولوی بٹالوی صاحب نے جماعت اہل حدیث کے وکیل اعظم ہونے کی حیثیت سے حکومت ہند اور مختلف صوبہ جات کے گورنروں کو لفظ وھابی کی منسوخی اور اہل حدیث نام کی الاٹمنٹ کی جو درخواست دی تھی کہ ان کی جماعت کو آئندہ وھابی کے بجائے اہلحدیث کے نام سے پکارا جائے اور سرکاری کاغذات اور خطوط اور مراسلات میں وھابی کے بجائے اہل حدیث لکھا جائے انگریز سرکار کی طرف سے ان کی سابقہ عظیم الشان خدمات اور جلیل القدر کارناموں کے پیش نظر اس درخواست کو گورنمنٹ برطانیہ نے باقاعدہ منظور کر کے لفظ وہابی کی منسوخی اور اہل حدیث کے نام کی الاٹمنٹ کی۔ باضابطہ تحریری اطلاع بٹالوی صاحب کو دی، سب سے پہلے حکومت پنجاب نے اس درخواست کو منظور کیا۔

لیفٹیننٹ گورنمنٹ پنجاب نے بذریعہ سکریٹری حکومت پنجاب مسٹر ڈبلو، ایم، ینگ صاحب بہادر نے بذریعہ چھٹی نمبری ۱۷۵۸ مجریہ ۳؍دسمبر ۱۸۸۶ء اس کی منظوری کی۔ اطلاع بٹالوی صاحب کو دی۔ اسی طرح گورنمنٹ سی، پی کی طرف سے ۱۴؍جولائی ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۴۷ گورنمنٹ یوپی کی طرف سے ۲۰؍جولائی ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۳۸۶ گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴؍اگست ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۷۳۲، گورنمنٹ مدراس کی طرف سے۔ ۱۵؍اگست ۱۸۸۸ء بذریعہ خط نمبری ۱۲۷ گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴؍مارچ ۱۸۹۰ء بذریعہ خط نمبری ۱۵۶، اس درخواست کی منظوری کی اطلاعات مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کو فراہم کی گئیں [۱]

اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی مسلم جماعت نے اپنا مذہبی ومسلکی نام کسی غیر مسلم حکومت سے الاٹ کرایا ہو۔ یہ صرف ہندوستان کے غیر مقلدوں ہی کو فخر حاصل ہے کہ برٹش گورنمنٹ سے اپنا نام اہل حدیث منظور کرایا۔

---

[۱] اشاعۃ السنہ شمارہ ۲ جلد ۱۱ ص ۳۲ تا ص ۳۹، جنگ آزادی از جناب پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری ص ۶۶

اور گورنمنٹ نے بھی سابقہ عظیم خدمات اور وفاداریوں کے صلہ میں اہل حدیث کا وہ نام جو پہلے دین اسلام کے عظیم خادموں کے لیے خاص تھا۔ اپنے ان خادموں کے لیے مخصوص کردیا۔

ع برعکس نہند نام زنگی کافور

یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ غیر مقلدوں کو اپنے لیے اہل حدیث نام الاٹ کرانے کی آخر ضرورت کیوں پیش آئی‘ اس کا ایک سامنے کا جواب تو یہ ہے کہ چونکہ انگریز دشمنوں اور سرفروشوں کو ایک سازش کے تحت وہابی کے نام سے موسوم کردیا گیا تھا‘ جہاں کوئی انگریز دشمنی کی بات کرتا اسے وہابی کہہ دیا جاتا۔ اب اگر غیر مقلدوں کو بھی وہابی کہا جاتا تو انگریز دشمنی کا توہم ہوسکتا تھا۔ جس سے انگریز کی نمک خواری اور وفاداری میں فرق آنے کا اندیشہ تھا۔
نیز نوازشات کے بجائے دار وگیر کے امکانات سامنے آسکتے تھے اس لیے غیر مقلدوں نے گورنمنٹ سے درخواست کرکے اپنا نام اہل حدیث کرالیا۔

اور تبدیلی نام کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نام کی عظمت سے فائدہ اٹھا کر عام مسلمان اور سادہ لوح لوگوں کو مغالطہ میں رکھا جائے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت انشاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گی۔

کیا ان حضرات کا ”اہل حدیث“ نام صحیح ہے؟

یہ سوال تین پہلوؤں سے قابل غور ہے۔ اولاً یہ کہ اہل حدیث نام رکھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ شاید یہ گروہ قرآن کریم سے کنارہ کش ہو کر صرف حدیث ہی سے منسلک ہے جیسا کہ فرقہ اہل قرآن کا۔ یہی مفہوم ہے کہ وہ حدیث رسول سے بیزار ہو کر صرف قرآن ہی کو اصل دین سمجھتا ہے۔

سوال کا دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کیا یہی لوگ اہل حدیث ہیں جیسا کہ اس نام کو اپنے لیے خاص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا دوسرے لوگ حدیث رسول کو تسلیم نہیں کرتے۔ جب کہ معاملہ برعکس ہے کیوں کہ حدیث کے حاملین وہ ہیں جو الفاظ ومبانی کے ساتھ حدیث کے معانی ومفاہیم پر تدبر رکھتے ہیں۔ اور ان حضرات کا معاملہ خود انھیں کے بڑے کی زبانی سنیے۔

نواب صدیق صاحب رہ فرماتے ہیں:

"ولہذالک تراھم یقتصرون منہا علی النقل ولایصرفون العنایة
الی فہم السنة و یظنون ان ذالک یکفیہم وھیہات بل المقصود
من الحدیث فہمہ وتدبر معانیہ دون الاقتصار علی مبانیہ"[1]

ترجمہ : اس لیے ان لوگوں کو دیکھو گے کہ یہ حضرات محض الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفاء کرتے ہیں اور حدیث کے فہم اور اس کے معانی ومفاہیم میں غور وخوض کی طرف متوجہ اور ملتفت نہیں ہوتے۔ اور اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ محض الفاظ کا نقل کرلینا ہی ان کے لیے کافی ہے۔ حالانکہ یہ خیال حقیقت سے دور ہے کیونکہ حدیث سے مقصود، حدیث شریف کا سمجھنا اور اس کے معانی ومفاہیم میں تدبر وتفکر کرنا ہے نہ کہ صرف الفاظ حدیث کی نقل پر اکتفا کرنا"۔

نیز نواب صاحب فرماتے ہیں :

" ولا یعرفون من فقہ السنة فی المعاملات شیئاً قلیلاً
لایقدرون علی استخراج مسئلة واستنباط حکم علی اسلوب
السنن واھلہا وھم اکتفوا عن العمل بالدعاوی اللسانیة و
عن اتباع السنة بالتسویلات الشیطانیة "[2]

ترجمہ : یہ لوگ معاملات کے بارے میں فہم حدیث سے بے بہرہ ہیں سنن اور اصحاب سنن کے طرز پر ایک مسئلہ کے استخراج اور ایک حکم کے استنباط پر بھی قادر نہیں، ہیں عمل کے بجائے زبانی دعوؤں اور حدیث کے بجائے مکائد شیطانیہ پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں :

" ولو کان لہم اخلاص .... لایکتفوا من علم الحدیث
علی رسمہ ومن العمل بالکتاب الاعلی اسمہ "[3]

---

[1] الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص۵۳ ؛ [2] الحطہ ص۵۱ ؛ [3] " ص۱۵۶۔

ترجمہ :۔ اگر یہ مخلص ہوتے تو علم حدیث کے صرف نشان اور عمل بالقرآن کے صرف نام پر اکتفاء نہ کرتے۔

ان صراحتوں سے ثابت ہوا کہ ان حضرات کا اہل حدیث نام رکھنا "برعکس نہند زنگی کافور" کی قبیل سے ہے۔

سوال میں تیسری چیز قابل غور یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے نومولود فرقے کا اہل حدیث نام رکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا یہ فرقہ قدیم الوجود ہے اور قرون اولیٰ ہی سے چلا آرہا ہے۔

چنانچہ "تاریخ اہل حدیث" کے مصنف شیخ احمد دہلوی اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل عنوانات قائم کرتے ہیں۔

۱:۔ صحابہ رض اور تمام سلف صالحین اہل حدیث تھے۔
۲:۔ تابعین اہل حدیث کہلائے
۳:۔ مسلمان فاتح اہل حدیث تھے
۴:۔ تبع تابعین اہل حدیث تھے
۵:۔ اہل علم کا لقب اہل حدیث تھا
۶:۔ علمائے امت اخیر زمانے تک اہل حدیث ہوں گے۔
۷:۔ ائمہ اربعہ اہلِ حدیث تھے
۸:۔ ائمہ اربعہ کے اکثر تلامذہ نے اہل حدیث مسلک پر وفات پائی۔
۹:۔ اہل حدیث ہر زمانے میں صحابہ رض جیسے ہیں [1]

نیز کتاب مذکور میں لکھتے ہیں :

"موجودہ تمام فرقوں کو ابھی کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ اہل حدیث رسول مقبول م فداہ اُمی وابی کے جانثاروں میں تھے۔ ع
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا [2]

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست مضامین کتاب ترجمہ تاریخ اہل حدیث صفحہ!۔

[2] ترجمہ تاریخ اہل حدیث صفحہ!۔

مزید تحریر فرماتے ہیں:

"آنحضرت ؐ کا فرمودہ ہے کہ لاتزال طائفۃ من امتی قائمۃ علی الحق لایضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللّٰہ" (رواہ البخاری والمسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی صداقت کا یہ طائفہ زندہ ثبوت ہے اس لیے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جملہ ارشادات بتمام وکمال حتی کہ الفاظ لسانِ وحی، ترجمان کی بھی حفاظت اور تبلیغ آپ کے عہد مبارک سے اس زمانے تک یہی خادمانِ دین برحق کر رہے ہیں[1]

غیر مقلد عالم مولانا محمد صدیق صاحب شیخ الحدیث فرماتے ہیں:

"لاتزال طائفۃ من امتی منصورین" حدیث کی تفسیر کرتے ہوئے علی ابن مدینی فرماتے ہیں فھم اصحاب الحدیث (ترمذی باب ماجاء فی اھل الشام)

ترجمہ: اس طائفہ سے مراد اہل حدیث کی جماعت ہے[2]

ہم یہاں قدرے تفصیل سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کیا پہلے زمانے میں "اہلحدیث" کا لقب اور اصطلاح انھیں معنوں میں مستعمل تھی جن معنوں میں یہ حضرات مراد لیتے ہیں یا اس لفظ میں تزویر اور تحریف معنوی کا ارتکاب کر کے یہ لوگ لفظ صحیح کو مصداق غیر صحیح پر منطبق کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم کو محقق کبیر حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے اس تبصرے سے کافی روشنی ملتی ہے۔ مولانا نیچریوں کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"واخوانھم الاصاغر المشھورین بغیر المقلدین الذین سمّوا انفسھم اھل حدیث وشتان ما بینھم وبین اصحاب الحدیث"[3]

ترجمہ: نیچریوں کے چھوٹے بھائی جو غیر مقلدین کے نام سے مشہور ہیں اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں حالانکہ ان میں اور اہل حدیث میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

---

[1] ترجمہ تاریخ اہل حدیث ص۱۸، [2] مسلک اہل حدیث ص۱۸؛

[3] الآثار المرفوعۃ ص۲۴۹؛

ان حضرات کے "اہل حدیث" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عامی اور کتاب و سنت کے نصوص سے ناآشنا ہونے کے باوجود بھی کسی امام و مجتہد کے تقلید و اتباع کا قائل نہ ہو۔ نیز ائمہ حدیث و فقہائے کرام و مجتہدین عظام کی خدمات جلیلہ کو اسلام کے لیے مضرت رساں خیال کرے۔ مولانا اسمٰعیل سلفی رحمہ سابق امیر جمعیۃ اہلِ حدیث پاکستان "اہل حدیث" کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ائمہ حدیث اور فقہاء کے مباحث، احناف و شوافع کے مناقشات اسلام کی خدمت کے بجائے بعض مقامات پر اسلام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے قرآن و سنت کے نصوص باہم منقسم ہو گئے"۔ [۱]

مولانا حبیب الرحمان اعظمی محدث تحریر فرماتے ہیں:

"اہل حدیث کی یہ اصطلاح بالکل حادث اور بدعت ہے اس معنی میں کبھی کسی کو اہل حدیث نہیں کہا گیا نہ ان کا پہلے کہیں وجود تھا"۔ [۲]

پہلے اہلِ حدیث کن کو کہا جاتا تھا؟

پہلے اہل حدیث ان حضرات کو کہا جاتا تھا جو درسِ حدیث، روایت حدیث، حفظ حدیث، تعلیم حدیث تدبر حدیث یا کسی بھی انداز سے خدمت حدیث کا مشغلہ رکھتے تھے۔ عقائد صحیحہ حقہ کے علمبردار اور اہل سنت والجماعت میں داخل تھے۔ خواہ وہ خود مجتہد رہے ہوں، یا مسالک مجتہدین میں سے کسی کے بھی مقلد رہے ہوں۔ علامہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر، المتوفی ۸۴۰ھ تحریر فرماتے ہیں:

" اذ من المعلوم ان اهل الحديث اسم لمن عنى به و انقطع فى طلبه كما قال بعضهم،

ان علم الحديث علم رجالٍ ترکوا الابتداع للاتباع
فاذا جن ليلهم كتبوه واذا اصبحوا اغدوا للسماع

---

[۱] تحریک اہل حدیث کا مدوجزر ص ۔
[۲] تحقیق اہل حدیث ۔

فھؤلاءِ ھم اھل الحدیث من ای مذھب کانوا۔[1]

حضرت امام ترمذی علیہ الرحمہ ایک طویل روایت نقل کرتے ہوئے جس میں ایک اعرابی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے سلسلہ میں سوال کرنے کا تذکرہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"سمعت محمد بن اسماعیل یقول قال بعض اھل الحدیث فقہ ھذا الحدیث ان القراءۃ علی العالم والعرض علیہ جائز"[2]

ترجمہ: میں نے محمد بن اسماعیل رحمہ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ بعض اہل حدیث کا کہنا ہے اس حدیث کی فقہ یہ ہے کہ عالم سے پڑھنا اور اس کے سامنے مسئلہ پیش کرنا جائز ہے۔"

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ امام بخاری علیہ الرحمہ کے نزدیک حدیث میں تدبر اور اس کے معانی و مسائل کا استنباط کرنے والے لوگ اہل حدیث ہیں۔

علامہ احمد بن محمد الخطیب قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد الساری شرح بخاری کے مقدمہ میں عنوان قائم فرماتے ہیں: "الفصل الاول فی فضیلۃ اھل الحدیث وشرفہ فی القدیم والحدیث" اس عنوان کے تحت یہ دو حدیثیں بیان فرماتے ہیں:

۱۔ "عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا واداھا فرب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ"

ترجمہ: نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تروتازہ رکھے اللہ تعالےٰ اس آدمی کو جس نے میری بات سنی، اسے یاد کیا، اس کی حفاظت کی اور دوسروں تک پہنچا دیا۔ بعض دفعہ فقہ جس کے پاس پہنچائی جائے وہ پہنچانے والے سے افقہ ہوتا ہے

۲۔ "عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] الروض الباسم جلد ۱ صفحہ ۱۲۲ مطبوعہ بیروت؛

[2] ترمذی شریف ابواب الزکوٰۃ جلد ۱ صفحہ ۷۹۔

علیہ وسلم اللّٰھم ارحم خلفائی قلنا یا رسول اللّٰہ ومن خلفائک قال الذین یروون احادیثی ویعلمونھا الناس"[1]

ترجمہ:- حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے اللّٰہ میرے خلفاء پر رحم فرما۔ ہم نے کہا۔ آپ کے خلفاء کون ہیں یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ آپؐ نے فرمایا، جو لوگ میری احادیث روایت کرتے ہیں اور دوسروں کو سکھاتے ہیں۔

ثابت ہوا کہ حفاظِ حدیث، محافظینِ حدیث، مبلغینِ حدیث، رواۃِ حدیث یہ سب حضرات اہلحدیث ہیں۔ نیز فرماتے ہیں:

"ومن شرف اھل الحدیث ما رویناہ من حدیث عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللّٰہ عنھما قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اولی الناس بی فی القیامۃ اصحاب الحدیث قال ابن حبان اذ لیس من ھٰذہ الامۃ قوم اکثر وا صلوٰۃ علیہ منھا وقال غیرہ المخصوص بھٰذا الحدیث نقلۃ الاخبار الذین یکتبون الاحادیث ویذبون عنھا الکذب اناء اللیل واطراف النھار وقال الخطیب فی کتابہ شرف اصحاب الحدیث قال لنا ابو نعیم ھٰذہ منقبۃ شریفۃ یختص بھا رواۃ الآثار و نقلتھا"[2]

ترجمہ:- اصحاب حدیث کے فضائل میں سے عبد اللّٰہ بن مسعود کی وہ حدیث بھی ہے جس کو ہم نے روایت کیا کہ نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن مجھ سے سب سے زیادہ قریب اصحاب حدیث ہوں گے۔ ابن حبان کہتے ہیں کیوں کہ ان سے زیادہ کوئی نبی کریم صلی اللّٰہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے والا نہیں ہے۔ بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں۔ اس حدیث سے مخصوص حدیث کے وہ ناقلین ہیں جو حدیثوں

---

[1] مقدمہ ارشاد الساری شرح البخاری جلد ۱ ص ۴ مطبوعہ نولکشور۔

[2] ارشاد الساری جلد ۲ ص ۵ مختصراً۔

کو لکھتے ہیں اور شب و روز ان سے کذب کو دفع کرتے ہیں۔ خطیب نے اپنی کتاب شرف اصحاب الحدیث میں ابو نعیم کے حوالہ سے کہا' یہ بڑی قابل قدر فضیلت ہے جس کے ساتھ حدیثوں کے رواۃ اور ناقلین ہی مخصوص ہیں۔

اس صراحت سے معلوم ہوا کہ درس حدیث، کتابت حدیث، دفاع حدیث کا مشغلہ رکھنے والے حضرات اہل حدیث ہیں۔ علماء سلف اور محدثین کرام کی کتابوں سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند تصریحات نقل کی گئیں، جن سے بیّن طور پر ثابت ہو گیا کہ اکابر کو جن حقائق اور خصوصیات کی بناء پر اہل حدیث کہا گیا تھا ان حقائق سے یہ موجودہ اہل حدیث دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اس لیے ان کا نام اہل حدیث کے بجائے لامذہب اور آزاد مشرب ہونا ہی مناسب اور قرین عقل و فہم ہے۔ کیونکہ فقہا و محدثین کی اصطلاح میں مذہب کا اطلاق بسا اوقات رائے و نقطہ نظر اور مسلک کے معانی پر ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے ائمہ اربعہ کے مسالک کو وہ لوگ مذہب کے لفظ سے بیان کرتے ہیں۔

حضرت امام نووی شارح مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فھو مذھبنا و مذھب الجمھور" [1]

نیز فرماتے ہیں:

"فمذھب الشافعی و ابی حنیفۃ والجمھور ان الابل افضل ثم البقر ثم الغنم کما فی الھدایا و مذھب مالک" [2]

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"اذ کانت ھذہ الاقوال کلھا معروفۃ لاھل السنۃ ------

------ بل لاھل المذھب الواحد منھم کمذھب احمد و غیرہ من الائمہ" [3]

---

[1] نووی شرح مسلم جلد ۱ صـ ۲۷۷؛ [2] نووی شرح مسلم جلد ۱ صـ ۲۸۱؛

[3] منہاج السنہ جلد ۱ صـ ۳۱۸۔

اورحضرت شاہ ولی محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں باب قائم کرتے ہیں :

" باب اسباب اختلاف مذاهب الفقهاء" [1]

خود غیر مقلد عالم اور محقق نواب صدیق حسن صاحب بھی مذہب کو اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے وصایا میں دوسری وصیت کے اندر فرماتے ہیں :

" دوم آنکہ مذاہب اربعہ را درحقیقت برابر دانند" [2]

نیز فرماتے ہیں :

" پانی کے مسئلہ میں امام مالک کا مذہب قوی تر ہے اور مسئلہ صیغ تشہد میں حضرت امام ابو حنیفہ کا مذہب صحیح تر ہے و مسئلہ صفات میں امام احمد کا مذہب زیادہ قوی ہے" [3]

ان کا مناسب نام کیا ہوگا؟

ان عبارات سے واضح ہوا کہ فقہا، و محدثین کے نزدیک (مذہب) کا اطلاق مذاہب ائمہ اربعہ پر بھی ہوتا ہے اور یہ حضرات ان مذاہب اربعہ میں سے کسی میں بھی داخل نہیں ہیں۔ اس بنیاد پر انھیں لامذہب اور آزاد مشرب کہنا زیادہ مناسب اور مبنی برحقیقت ہے۔

چنانچہ نواب قطب الدین صاحب مظاہر حق اور بعض دیگر علماء نے انھیں " لامذہب " ہی کے نام سے یاد کیا ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں نواب صاحب کی عبارت نقل کی جا چکی۔

کسی بھی جماعت کو سمجھنے کے لیے اس جماعت کے بانی اور مرکزی شخصیات کا تعارف بہترین رہنما ہوتا ہے۔ اس لیے آئندہ صفحات پر جماعت اہل حدیث کے بانی اور اہم شخصیات کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۳۳۹۔

[2] مآثر صدیقی حصہ چہارم ص۱۰۔

[3] " " ص۲۰۔

مولانا عبدالحق بنارسی

مولانا عبدالحق بن مولانا فضل اللہ نیوتنی ثم بنارسی کی ولادت قصبہ نیوتنی ضلع اناؤ میں ۱۲۰۶ھ میں ہوئی۔ سفر حج میں سید صاحب رہ کے ہم قافلہ تھے۔ لیکن ائمہ کرام پر بدزبانی اور دیگر فاسد نظریات کی بنا پر سید صاحب نے ان کو اپنے قافلہ سے نکال دیا تھا۔ انھیں نازیبا حرکتوں کے مکہ معظمہ میں بھی مرتکب ہوئے، سزائے قید ہوئی، رہا ہوکر مدینہ گئے لیکن "جبل گردد جبلت نہ گردد" مدینہ میں بھی ائمہ کرام اور مجتہدین عظام پر زباں درازی کی۔ قاضی مدینہ کے مطلع ہونے کے بعد خوف تعزیر نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ غرض طبع ومزاج کی کج ادائیوں نے انھیں ہر محل شرف سے محروم ہی رکھا ہندوستانی علماء میں سب سے پہلے انھیں نے فتنۂ ترکِ تقلید کی بناء ڈالی اور مسلسل علمائے حق سے برسرپیکار رہے، عدم تقلید پر کتابیں بھی لکھیں، مناظرے بھی کیے۔ حکیم مولانا عبدالحی لکھتے ہیں:

ثم سافر الی الحجاز فی رکب السید الامام احمد بن عرفان الشهید البریلوی فلما وصل الی المدینة المنورة بعد الحج تکلم فی بعض المسائل الخلافیة علی عادته وتفوه فی حق المجتهدین ورمی بالضلال اصحاب المذاهب الاُخر من الاحناف والشافعیة وکان اذ ذاك الشیخ محمد سعید الاسلمی بالمدینة المنورة فوشی به الی القاضی فلما علم ذاك عبد الحق خرج من المدینة مختفیا وذهب الی الجزیرة۔ -----	سید احمد شہید بریلوی کے قافلہ کی معیت میں حجاز گیے۔ جب حج سے فارغ ہوکر مدینہ پہونچے تو اپنی عادت کے مطابق بعض مسائل خلافیہ میں گفتگو کی۔ اور مجتہدین کرام پر بد زبانی کی اور انہیں گمراہ کہا۔ شیخ محمد سعید نے حاکم مدینہ کو اس کی اطلاع دی، جب عبدالحق کو معلوم ہوا تو آہستہ سے وہاں سے نکل بھاگے۔ ....

وکان عبد الحق لا یتقید بمذهب ولا یقلد احداً فی شیٔ من امور دینیة بل یعمل بنصوص الکتاب والسنة	عبدالحق کسی مذہب سے منسلک نہ تھے اور نہ ہی امور دینیہ میں کسی کی تقلید کرتے تھے۔ بلکہ کتاب وسنت کے نصوص

ویجتھد برایہ ولذالک جرت بینہ وبین الاحناف مباحثات کثیرۃ فی الاجتھاد والتقلید ومن مصنفاتہ الدر الفرید فی المنع عن التقلید۔[1]

پر عمل کرتے اور اپنی رائے سے اجتہاد کیا کرتے تھے اسی بنا پر ان کے اور احناف کے مابین اجتہاد اور تقلید کے سلسلہ میں مناظرے ہوئے انہوں نے الدر الفرید فی المنع عن التقلید کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی رہ شاگرد حضرت شاہ اسحاق صاحب دہلوی رہ لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحق بنارسی نے ہزار ہا آدمی کو عمل بالحدیث کے پردے میں قید مذہب سے نکالا' اور مولوی صاحب نے ہمارے سامنے کہا کہ عائشہؓ حضرت علیؓ سے لڑ کر مرتد ہوئی' اگر بے توبہ مری تو کافر مری (والعیاذ باللہ) اور صحابہ کو پانچ پانچ حدیثیں یاد تھیں ہم کو سب کی حدیثیں یاد ہیں۔ صحابہ رضؓ سے ہمارا علم بڑا ہے' صحابہ کو علم کم تھا۔ بعد تھوڑے عرصہ کے مولوی عبدالحق صاحب' مولوی گلشن علی صاحب کے پاس جو دیوان راجہ بنارسی کے شیعہ مذہب کے تھے' گئے' اور کہا کہ میں شیعہ ہوں۔ اب ظاہراً شیعہ ہونا ہوں اور میں نے عمل بالحدیث کے پردہ میں وہ کام کیا کہ عبداللہ بن سبا سے نہ بنا تھا ہزار ہا اہل سنت کو قید مذہب سے نکال دیا۔ اب ان کا شیعہ ہونا بہت آسان ہے چنانچہ مولوی گلشن علی صاحب نے تیس روپے ماہواری ان کی نوکری کروا دی۔"[2]

مولوی عبدالحق صاحب کا ۱۲۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ حکیم مولانا عبدالحی صاحب لکھتے ہیں:

"وتوفی محرماً بمنی فی ثانی ذی الحجہ عام ست وسبعین ومائتین والف۔"[3]

نواب صدیق حسن صاحب

نواب صاحب فرقۂ غیر مقلد کے بہت بڑے پیشوا اور امام ہیں۔ غیر مقلدین میں ان کو مرکزی اور بنیادی شخصیت قرار

---

[1] نزہۃ الخواطر ص۲۳۹ و ص۲۴۰ جلد ۷۔

[2] کشف الحجاب ص۲۱ مصنف قاری عبدالرحمٰن پانی پتی۔

[3] نزہۃ الخواطر ص۲۴۰ جلد ۷۔

دیا جاتا ہے۔ غیر مقلدین ان کو امام السنہ خاتم المحدثین اور مجدد ہند کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں بعض اعتبار سے "شیخ الکل فی الکل" پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ آپ ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ میں اپنے ننہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔[ل] ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کر کے اعلیٰ تعلیم آپ نے مفتی صدرالدین صاحب آزردہ دہلوی سے حاصل کی۔ سند حدیث جن اساتذہ کرام سے حاصل کی ان میں شیخ المعمر عبدالحق مرحوم بن فضل اللہ ساکن نیوتنی بانی فرقہ اہل حدیث خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[ک]

"آپ تقلید کو عار سمجھتے تھے، ائمہ اربعہ کے اقوال تو الگ رہے آپ صحابہ کرام رض کی تفسیر قرآن کی حجیت کے بھی قائل نہیں تھے۔ ائمہ فقہ و تصوف بالخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رح سے سوءِ ظنی رکھتے تھے "فرماتے ہیں" ہم لوگ صرف کتاب و سنت کی دلیلوں کو اپنا دستور العمل ٹھہراتے ہیں اور اگلے بڑے بڑے مجتہدوں اور عالموں کی طرف منسوب کرنے سے عار کرتے ہیں۔"[ک]

نیز رقمطراز ہیں:

"حاصل آنکہ حجت بتفسیر صحابہ غیر قائم است لاسیما نزد اختلاف۔"[ھ]

حکیم عبدالحی لکھنوی رح لکھتے ہیں:

"وکان لہ سوء الظن بائمۃ الفقہ والتصوف جداً لاسیما ابی حنیفۃ"[ل]

اس بدگمانی کی وجہ سے نواب صاحب نے حضرت امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کو روایت حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔ نواب صاحب نے اپنی کتاب "بدور الاہلہ" میں ایک حدیث کا ضعف ثابت کرنے کے لیے اس کے ایک راوی ربیع ابن صبیح پر ائمہ کرام کی جرح نقل کی ہے لیکن چونکہ ائمہ نے انھیں شیخ صالح اور رجل صالح بھی کہا ہے جس سے ان کی توثیق ہوتی ہے۔ نواب صاحب

ل ملاحظہ ہو مآثر صدیقی ج ۲ ص ۔

ک " جلد ۲ ص ۱۔

ک " ۲ ص ۱۱۔

ک ترجمان وہابیہ ص ۲۰۔

ھ رسائل اہل حدیث ص ۲۵ بحوالہ بدور الاہلہ ص ۱۳۹۔

ل نزہۃ الخواطر جلد ۸ ص ۱۹۱۔

نے اس توثیق کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان ائمہ کے صالح کہنے سے راوی کا ثقہ ہونا لازم نہیں آتا جس طرح سے امام ابو حنیفہ باتفاق مخالف و موافق رجل صالح ہیں لیکن وہ ائمہ حدیث کے نزدیک اپنے تلامذہ کی طرح ضعیف ہیں۔ نواب صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"ابوزرعہ گفتہ" شیخ صالح" وابو حاتم گفتہ رجل صالح انتہی۔ واز وصفش بصلاح لازم نمی آید کہ در حدیث ثقہ باشد۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رح مثلاً صالح است باتفاق موافق و مخالف ولکن نزد ائمہ حدیث ضعیف است مثل تلامذہ خود"۔[۱]

نواب صاحب نے خود اجتہادی کے زعم میں بزعم خویش بہت سے مسائل ایجاد کیے جو قرآن وحدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ ان کی کتاب "بدور الاھلہ من ربط المسائل بالادلہ" سے چند مسائل ذکر کیے جاتے ہیں نواب صاحب کے اجتہاد کے مطابق :

۱:۔ منی، شراب، مردار، کتا، خنزیر تمام جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔[۲]

۲:۔ عورت کی نماز بغیر تمام ستر چھپائے صحیح ہے۔[۳]

۳:۔ چھ چیزوں کے علاوہ بقیہ تمام چیزوں میں سود لینا جائز ہے۔[۴]

۴:۔ جو جانور بندوق کے شکار سے مرجائے وہ حلال ہے۔[۵]

۵:۔ قربانی کی ایک بکری بہت سے گھر والوں کی طرف سے کفایت کرتی ہے اگرچہ سو آدمی ہی ایک مکان میں کیوں نہ ہوں۔[۶]

یہ ہے کرشمہ اجتہاد کا ایک ہلکا سا نمونہ۔

جو چاہے آپ کا علم کرشمہ ساز کرے

نواب صاحب اور انگریز

انگریز جس کا ظلم وستم، اسلام بیزاری اور مسلم دشمنی عالم آشکار ہے۔ مسلمانوں پر ان کے مشق وستم کی تفصیل بیان کرتے

---

۱ رسائل اہل حدیث ص۲۶ بحوالہ بدور الاھلہ ص۲۳۵، ۴ بدور ص۲۳۵-۲۳۶ ۔

۲:۔ بدور ص۱۵-۱۶ ،۔ ۵ " ص۳۳۵ ۔

۳:۔ " ص۳۹۰ ۔ ۶ " ص۳۴۱ ۔

ہوئے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رہ تحریر فرماتے ہیں :

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا. سکھ رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اغلام کروانا. فتحپوری کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا" [1]

یہ ان انگریزوں کا اہل اسلام کے ساتھ سلوک تھا. اسلام کے ساتھ تو اس سے بھی بدتر سلوک تھا. طرح طرح کے فتنوں اور سازشوں کے منبع و مصدر اور سرچشمہ یہی انگریز ہی بنے ہوئے تھے. نیچریت، مرزائیت، اباحیت، فتنۂ انکار حدیث وغیرہ بے شمار اسلام دشمن فتنے انھیں انگریزوں کے بطن فتنہ پرور سے پیدا ہو رہے تھے. لیکن نواب صاحب انھیں انگریزوں سے دوستی، وفاداری، عشق و محبت کا دم بھرتے تھے اور اپنی بے مثال وفاداری کی داستان ان لفظوں میں سناتے ہیں :

"جو خیر خواہی ریاست بھوپال وغیرہ نے اس زمانہ میں کی ہے وہ گورنمنٹ برطانیہ پر ظاہر ہے. ساگر و جھانسی تک سرکار انگریز کو مدد غلہ وغیرہ سے دی جس کے عوض سرکار نے پرگنہ بیرسیہ جمع ایک لاکھ روپیہ عنایت فرمایا" [2]

تعاون علی الاثم والعدوان کی اس اعلیٰ نظیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی پڑھتے چلئے، فرماتے ہیں :

"یہ بغاوت جو ہندوستان میں برمانۂ غدر ہوئی اس کا نام جہاد رکھنا ان لوگوں کا کام ہے جو اصل دین سے آگاہ نہیں، اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن و امان اٹھانا چاہتے ہیں" [3]

نواب صاحب کے فرزند ارجمند جناب سید علی خاں اپنے والد کے فضائل و مناقب گناتے ہوئے فرماتے ہیں :

"جو ایک دوست دار گورنمنٹ کی مہربانیوں اور احسانوں، روز افزوں عزت

---

[1] نقش حیات ص۴۵ ؛
[2] ترجمان وہابیہ ص۱۱۳ ؛
[3] ترجمان وہابیہ ص۱۰ ؛

افزائیوں کا دل سے ممنون ہو جس کے علم وفضل اور انتظامی کارناموں کی تعریف
اور اعمال کا استحسان صاحبان عالی بہادر اور وائسرایان ہند اپنے خرائط اور خطوط
اور تقریروں اور پرائیوٹ چٹھیوں میں متواتر کر چکے ہوں جو گورنمنٹ کے جبروت
وصولت سے پوری طرح واقف ہو'' [1]

جنگ مصر کے موقع پر نواب صاحب کی وفاداریوں سے خوش ہو کر کرنل کنکیڈ صاحب بہادر
اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں نہایت خوشی سے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے بلاشبہ نہایت عمدگی
سے نواب بیگم صاحبہ کو نیک صلاح دے کر اچھی کارروائی کی تمام بری اور بیوفائی
کی باتوں کے ٹالنے اور روکنے کی سعی ایسے وقت میں جب کہ سرکار انگریزی کی
فوج مصر کے مخالفین سے جنگ کر رہی ہے۔ فرمائی ایسے بڑے شہر میں جہاں ہر قسم کے
مسلمان موجود ہیں۔ نواب بیگم صاحبہ عالیہ کی وفاداری کے بے شک آپ باعث ہیں'' [2]

صاحبزادہ محترم تحریر فرماتے ہیں:

''اسی طرح والس صاحب بہادر کرنل بیزمین صاحب بہادر، ولیم ولبی آسبورن
صاحب بہادر، بارسٹھ صاحب بہادر، کرنل بیربڈو صاحب بہادر، اور متعدد حکام
نے والاجاہ (نواب صاحب) کے کاموں کی بے حد تعریف و توصیف کی'' [3]

آپ نے ۲۹ رجمادی الثانی ۱۳۰۷ھ میں وفات پائی۔

نواب صاحب کی نہایت مستند سوانح مآثر صدیقی میں ہے کہ جس وقت اس حادثۂ دل
آشوب کی خبر گورنمنٹ آف انڈیا کو پہنچی تو اس وقت گورنمنٹ کی جانب سے ٹیلیگرام پہنچا کہ:

''منجانب گورنمنٹ آف انڈیا ان کی نعش کے ساتھ شاہی اعزاز عمل میں لایا جائے'' [4]

---

[1] مآثر صدیقی جلد ۳ صـ ۱۳۳۔
[2] 〃 〃 صـ ۱۶۵۔
[3] 〃 〃 صـ ۱۶۵۔
[4] ج ۳، صـ ۲۰۳۔

مولانا نذیر حسین صاحب دہلوی غیر مقلدوں کے امام الہدی آیت من آیات اللہ شیخ الکل فی الکل شمس العلماء مولانا سید نذیر حسین سورج گڈھی ثم دہلوی قصبہ سورج گڈھ ضلع مونگیر صوبہ بہار میں ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے [۱]

انھیں غیر مقلدین کا رکن رکین اور ستون محکم سمجھا جاتا ہے اپنی جماعت میں ان کی ہستی بڑی مایۂ ناز قابل فخر ہے۔ غیر مقلدیت کی فروغ واشاعت میں ان کی خدمات کا بڑا دخل ہے ان کے زندگی کے پورے ۷۵ سال سلف صالحین پر تنقید کرنے اور ان کے عظیم دینی اور علمی کارناموں میں کیڑے نکالنے اور اپنے خود ساختہ الزامات کا ہدف بنانے میں صرف ہوئے۔

اکثر غیر مقلد علماء کے آپ استاذ ہیں۔ آپ اپنے آپ کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسہ حضرت شاہ اسحٰق کا شاگرد بتلاتے ہیں۔ لیکن اس نسبت میں کہاں تک سچائی ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت شاہ اسحٰق کے تلمیذ اجل اور حضرت شاہ عبدالعزیز رہ کی مجالس وعظ کے حاضر باش قاری عبدالرحمان صاحب رہ پانی پتی لکھتے ہیں:

> "سید نذیر حسین نے کس روز میاں صاحب سے پڑھا ہے فقط ہجرت کے ایام میں بطمع اغواءِ خلق کے ایک ایک حدیث اوائل چند کتب کی سنا کر ایک پرچہ سند کا لکھوالیا وعظ میں بھی کبھی کبھی جانا نصیب ہوا ہو۔ کبھی کبھی تعطیل میں مسئلہ پوچھنے آتے تھے، اور حفیظ اللہ خاں صاحب وعظ میں جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی حرف جلالین کا پوچھنے آتے تھے۔ اور جناب مولانا شاہ عبدالعزیز رہ کے زمانے میں تو ان دونوں کا وجود بھی دہلی میں نہ تھا۔ کبھی ان کو ہم نے بڑے شاہ صاحبؒ کے زمانے میں نہیں دیکھا۔ دونوں میاں صاحب اہل سنت اور حنفی تھے اور یہ متقی (تقیہ کرنے والے) غیر مقلد دشمنان اہل سنت ہیں پھر کس طرح؟ جناب میاں صاحب کے تلمذ کے وسیلے سے ان کو مانتے ہیں اور اپنا دین برباد کرتے ہیں" [۲]

---

[۱] تاریخ التقلید ص۱۱ بحوالہ انگریز اور اہل حدیث ص۲۲۔

[۲] رسائل اہل حدیث ص۳ بحوالہ کشف الحجاب ص۱۳۔

مولانا حکیم عبدالحیٔ ان کے حلقۂ درس کا ایک نقشہ بیان کرتے ہیں کہ:

"شواہد میں اعشیٰ کا ایک شعر آگیا اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے پھر بھی ناکام رہے۔" [1]

اس مبلغ علم کے باوجود جرأت کا یہ عالم ہے کہ:

"ہمت آپ کی بالکل طرف مطاعن فقہا، اور تجہیلات صحابہ کے مصروف ہے" [2]

مولوی نذیر صاحب اور انگریز انگریزوں کی سفاکیوں سے تنگ آکر اس دور کے مشاہیر واکابر جید علمارکرام نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ تیار کیا لیکن میاں نذیر حسین نے نہ صرف یہ کہ اس پر دستخط کرنے سے انکار کیا بلکہ انگریزوں سے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے اس فتوے کی شدید مخالفت بھی کی۔ میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی افضل حسین بہاری لکھتے ہیں کہ:

"یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ میاں صاحب گورنمنٹ انگلشیہ کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز کے خلاف فتویٰ جہاد کا دیا تو میاں صاحب نے اس پر دستخط کیے، نہ مہر لگائی "خود فرماتے تھے کہ میاں وہ ہلڑ تھا شاہی نہ تھی وہ بے چارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرتا بہادر شاہ کو بہت سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں مگر وہ باغیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ کرتے تو کیا کرتے" [3]

یہ وہ دور تھا کہ انگریزوں کی طرف سے مسلمان عورتوں کی عزت لوٹی جاتی تھی انکے پستان تک کاٹ ڈالتے تھے، مسلمانوں کی لاشیں درختوں کی شاخوں پر لٹکائی جاتی تھیں لیکن میاں صاحب کو ان مسلمان عورتوں اور مردوں پر رحم نہیں آیا' آیا تو کس پر آیا۔ ملاحظہ ہو:

"ڈاکٹر حافظ مولوی نذیر احمد صاحب فرماتے تھے کہ عین زمانہ غدر میں مسز لیس

---

[1] دہلی اور اس کے اطراف ص۲۷۔

[2] کشف الحجاب ص۹ بحوالہ رسائل اہل حدیث ص۳۴۔

[3] الحیات بعد الممات ص۱۲۵۔

زخمی میم کو جس وقت میاں صاحب نے دیکھا تو روئے اور اپنے مکان میں اٹھالائے اپنی اہلیہ اور عورتوں کو ان خدمت کے لیے نہایت تاکید کی ...... امن وامان قائم ہونے کے بعد میم کو انگریزی کیمپ میں پہنچایا جس کے نتیجے میں آپ کو اور آپ کے متوسلین کو گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے امن وامان کی چٹھی ی''۔ ۱

ھیں خدمات عظیمہ کے صلہ میں سفرج کو جاتے ہوئے میاں صاحب کو سرکار کی طرف سے سند لی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے؛

'' مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقتدر عالم ہیں جنھوں نے مشکل اور نازک وقتوں میں اپنی وفاداری اور نمک حلالی گورنمنٹ برطانیہ پر ثابت کی اب وہ اپنے فرض زیارت کعبہ کے ادا کرنے کو جاتے ہیں، امید کرتا ہوں کہ جس کسی افسر برٹش گورنمنٹ کی مدد چاہیں گے وہ ان کی مدد کرے گا کیوں کہ وہ کامل طور سے اس کے مستحق ہیں''۔ ۲

یاں صاحب کا انتقال ۱۳۲۰ھ میں ہوا۔

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی ۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ سید نذیر حسین صاحب کے خصوصی تلامذہ میں تھے۔ مولانا حکیم عبدالحی صاحب لکھتے ہیں؛

'' ثم لازم السيد نذير حسين المحدث وقرأ عليه المشكوٰة والصحاح الستة وصحبه مدة طويلة ''۔ ۳

ان کی شخصیت جماعت اہل حدیث میں نامی گرامی اور نہایت ہی عظیم ہے اپنے رسالہ اشاعۃ السنۃ کے ذریعہ انھوں نے غیر مقلدیت کی خوب خوب اشاعت کی، انھیں کی کوششوں سے غیر مقلدوں کا نام اہل حدیث ہوا۔ طبیعت میں مذہبی تعصب بدرجہ اتم تھا۔ صاحب نزہۃ الخواطر کہتے ہیں؛

'' ويرد على كل من يخالفه فأفرط في ذالك وجاوز عن حد

---

۱ الحیاۃ بعد المماۃ ص ۲۷۵۔ ۳ نزہۃ الخواطر ص ۴۲۶ جلد ۸۔
۲ " " ص ۱۴۔

القصد والاعتدال وشدد النکیر علی مقلدی الائمة الاربعة لاسیما الاحناف وتعصب في ذٰلك تعصبًا غیر محمود، فثارت به الفتن" ۱

مولانا محمد حسین صاحب اور انگریز

مولوی حسین صاحب انگریز نوازی میں اپنے دونوں پیشروؤں سے بھی آگے تھے۔ مشہور مورخ پروفیسر محمد ایوب قادری تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مفصل رسالہ "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" لکھا" ۲

رسالہ مذکورہ میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

"ہندوستان دارالاسلام ہے اس لیے یہاں جہاد جائز نہیں بلکہ اس وقت پوری دنیا میں کہیں بھی جہاد جائز نہیں" ۳

اس خدمت کے صلہ میں مولوی صاحب کو حکومت کی طرف سے جاگیر عطاء کی گئی تھی ۴

---

۱ نزہۃ الخواطر ص۴۲۸ ج۸ ۔
۲ جنگ آزادی ص۶ ۔
۳ الاقتصاد فی مسائل الجہاد ص۲۵ ۔
۴ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص۲۹ ۔

بابت سنہ ۱۴۱۵ھ

دوسرا محاضرۂ علمیہ

بر موضوع

رد غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

ضرورت تقلید

تعلیمات کتاب وسنت ہی اصل دین اور سرچشمۂ ہدایت ہیں، مگر ان سے حصولِ ہدایت ان کے صحیح فہم یا فہم صحیح رکھنے والے کسی فرد پر اعتماد کیے بغیر ممکن نہیں۔ کتاب وسنت میں جو علوم منظم طریقہ پر بیان کیے گیے ہیں جن کے حصول ہی پر فوز وفلاح کا دارو مدار ہے وہ پانچ علوم ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

باید دانست کہ معانی منظومۂ قرآن خارج از پنج علم نیست۔ علم احکام از واجب ومندوب ومباح مکروہ وحرام خواہ از قسم عبادت باشد یا معاملات یا تدبیر منزل یا سیاست مدنیہ و تفصیل این علم ذمۂ فقیہ است وعلم مخاصمت باچہار فرقہ ضالہ، یہود ونصاری ومشرکین و منافقین وتفریع بریں علم ذمۂ متکلم ست وعلم التذکیر بآلاء اللہ از بیان خلق آسمان وزمین والہام بندگان بآنچہ ایشاں در بایست از بیان صفات کاملہ او تبارک وتعالیٰ وعلم التذکیر بایام اللہ یعنی بیان وقائع کہ آں راحق تعالیٰ

معلوم ہے کہ قرآن کریم کے معانی منظومہ پانچ علم کے علاوہ نہیں ہیں (۱) احکام واجب، مندوب مباح مکروہ اور حرام کا جاننا خواہ یہ احکام از قبیل عبادت ہوں یا معاملات یا تدبیر منزل یا سیاست مدنیہ کی قبیل سے ہوں۔ اس علم کی تفصیل فقیہ کے ذمہ ہے (۲) چاروں گمراہ فرقوں یعنی یہود و نصاری، مشرکین ومنافقین کے ساتھ مخاصمت کا علم، اس کی تفصیل متکلم کے سپرد ہے (۳) اللہ کی نعمتوں کے ذریعہ یاد دہانی کا علم یعنی زمین و آسمان کی تخلیق، بندوں کو ان کی کارآمد چیزوں سے واقف کرانا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ

ایجاد فرمود است از جنس انعام مطیعین وتعذیب مجرمین وعلم التذکیر بموت وما بعداں از حشر ونشر وحساب ومیزان وجنت ونار وحفظ تفاصیل این علوم والحاق احادیث وآثار مناسبۂ آں وظیفہ واعظ ومذکراست ؎

کا بیان (۴) اللہ کے مخصوص دنوں کے ذریعہ یاد دہانی کرانا یعنی اللہ کے پیدا کردہ حوادث کو بیان کرنا۔ مثلاً اطاعت گزاروں کو جو اللہ نے نوازا اور مجرمین کو جو سزا دی (۵) موت اور اس کے مابعد کے ذریعہ یاد دہانی کرانا مثلاً حشر و نشر، حساب و کتاب، میزانِ اعمال اور جنت وجہنم کا تذکرہ۔ ان تینوں علوم کی تفصیل اور ان کے مناسب احادیث و آثار کو ملانا واعظ اور مذکر کا کام ہے۔

احادیث نبویہ چونکہ کتاب الہی کی فرع اور اس کی تبیین وتفسیر ہیں جیساکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس (النحل) ہم نے آپ پر قرآن اتارا کہ لوگوں کے سامنے آپ اسے واضح کریں۔

اس لیے احادیث کے اصل علوم بھی انہیں پانچ قسموں پر منحصر ہیں ـــــــــ قرآن و حدیث کے ان پانچ علوم میں سے علم احکام کے علاوہ بقیہ چار علوم نسبتاً واضح اور سہل ہیں۔ ہر وہ آدمی بخوبی انھیں سمجھ سکتا ہے جس نے عربی اور اس کے اصول وضوابط سے باضابطہ واقفیت حاصل کر لی ہو۔ لیکن علم احکام مذکورہ علوم کی بنسبت غامض اور دقیق ہے۔۔

صاحب مدار الحق تفسیر عزیز کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں۔

"تفریق اقسام قرآن از محکم ومشابہ وناسخ ومنسوخ وظاہر ومأول وامتیاز ہر قسم از قسم دیگر واستنباطِ احکام از ہر قسم بغایت مشکل است۔ (انتہیٰ) پس یہ صریح ہے اس باب میں کہ قرآن شریف بحسب استنباط احکام شرعیہ کے غایت مشکل ہے، کما قال اللہ تعالیٰ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ اگرچہ آسان بحسب پند اور

؎ الفوز الکبیر ص۳۔

وعظ اور نصیحت کے۔ کما قال اللہ تعالیٰ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر[1]

علم احکام بغایت مشکل اور غامض ہے اسے قرآن وحدیث سے اخذ کرنے کے لئے عربی زبان کے قواعد وضوابط کی واقفیت ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے اعلیٰ درجہ کی فہم و فراست، ذہانت وذکاوت، فکر ونظر کی بلندی، قرآن وحدیث کے علوم کا بقدر ضرورت احاطہ، ناسخ ومنسوخ، محکم متشابہ، ظاہر وماؤل کا علم اور ساتھ ہی ساتھ حزم واحتیاط نیز تقویٰ وطہارت کی صفات درکار ہیں۔

ایسے شخص کو قرآن کریم میں "اصل ذاکر" اور "منیب" اور احادیث میں مجتہد کہا گیا ہے۔

علمائے محققین نے درجہ اجتہاد تک رسائی کے شرائط تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

حضرت ولی اللہ محدث دہلوی رح فرماتے ہیں:

وشرطه انه لابد له ان یعرف من الکتاب والسنة ما یتعلق بالاحکام ومواقع الاجماع وشرائط القیاس وکیفیة النظر وعلم العربیه والناسخ والمنسوخ وحال الرواة ومعرفة کلام من مضیٰ من الصحابة والتابعین وتبعهم فی ابواب الفقة ... قال البغوی والمجتهد من جمع خمسة انواع من العلم، علم کتاب الله عزوجل علم سنة رسول الله صلی الله علیه واله وسلم وعلم اقاویل علماء السلف من اجماعهم واختلافهم وعلم اللغة وعلم

اور اجتہاد کی شرط یہ ہے کہ اجتہاد والے کو ضرورت ہے کہ قرآن وحدیث اس قدر جانتا ہو جو احکام سے متعلق ہے اور اجماع کے موقعوں اور قیاس صحیح کی شرطوں اور نظر کی کیفیت اور علم عربیت اور ناسخ اور منسوخ اور راویوں کے حال سے اور صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے کلام سے فقہ کے ابواب میں واقف ہوں۔ بغوی نے کہا ہے کہ مجتہد وہ عالم ہے جو کہ پانچ طرح کے علم کا حاوی ہو۔ اول کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کا۔ دوم علم حدیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ وسلم۔ سوم علمائے سلف کے اقوال کا کہ ان کا اتفاق کس قول پر ہے اور اختلاف کس قول میں۔ چہارم علم لغت۔ پنجم

---

[1] مدارالحق ص۳۴۔

القياس وهو طريق استنباط الحكم عن الكتاب والسنة اذلم يجده صريحا فى نص كتاب او سنة او اجماع.[1]

علم قیاس، اور قیاس قرآن وحدیث سے حکم نکالنے کا طریقہ ہے جس صورت میں کہ حکم مذکور صریح قرآن وحدیث یا اجماع کے نصوص میں مجتہد نہ پاوے۔

علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ شرائط اجتہاد کے جامع شخص کے لیے کسی دوسرے کی تقلید کرنی جائز نہیں ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لم يذهب احد من المحصلين الى ان المجتهد يجوز له ان يعمل بموجب اجتهاد غيره.[2]

علمائے کرام میں سے کوئی بھی اس بات کی طرف نہیں گیا ہے کہ مجتہد کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ دوسرے کے اجتہاد پر عمل کرے۔

صاحب مدار الحق رح فرماتے ہیں:

قال الشامى فى رد المحتار شرح الدر المختار فى بحث رسم المفتى لان المجتهد مامور بالعمل بمقتضى ظنه اجماعًا انتهى وقال فى مسلم الثبوت والعضدى شرح مختصر الاصول وتحرير الاصول وغيرها من كتب الاصول لو حكم بخلاف اجتهاده كان باطلاً اتفاقا لانه يجب عليه العمل بظنه ولا يجوز له التقليد مع اجتهاده اجماعًا.[3]

علامہ شامی نے در مختار کی شرح رد مختار میں رسم المفتی کی بحث کے اندر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ اجماع ہے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے اور مسلم الثبوت اور عضدی شرح مختصر الاصول اور تحریر الاصول وغیرہ کتابوں میں ہے کہ اگر اپنے اجتہاد کے خلاف عمل کرے گا تو یہ اتفاقاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے کسی دوسرے کی تقلید اس کے لیے اجماعاً ناجائز ہے۔

---

[1] عقد الجید ص۳۰۔ [2] احیاء العلوم ص۳۲۱ ج۲۔

[3] مدار الحق فی رد معیار الحق ص۳۶۰-۳۶۹۔

جس طرح مجتہد کے لیے تقلید جائز نہیں اسی طرح غیر مجتہد کے لیے تقلید کا ترک جائز نہیں ہے آئندہ حقیقت تقلید کی بحث میں انشاء اللہ قرآن وحدیث اجماع اور قیاس کی روشنی میں اس کے دلائل بتفصیل عرض کیے جائیں گے۔ یہاں اجمالاً اکابر علمائے امت کی چند تصریحات پیش کی جاتی ہیں جو یقیناً کتاب وسنت ہی سے مستفاد ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:

لان العامی یجب علیہ تقلید العالم[1]	اس لیے کہ عامی آدمی کے لیے عالم کی تقلید واجب ہے

حضرت شاہ صاحبؒ عقد الجید میں فرماتے ہیں:

ویجب علی من لم یجمع ھٰذہ الشرائط تقلیدہ فی مایعن علیہ من الحوادث[2]	جو شخص شرائط اجتہاد کو جامع نہ ہو اس کے لئے پیش آمدہ حوادث میں مجتہد کی تقلید واجب ہے

صاحب مدار الحق رح علامہ شعرانی رح کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

وقال عبد الوھاب الشعرانی فی المیزان واما من لم یصل الی شھود عین الشریعۃ الاولیٰ وجب علیہ التقلید[3]	عبد الوہاب شعرانی رح نے میزان میں لکھا ہے کہ جو شخص عین شریعت کے شاہدہ تک نہ پہنچا ہو اس پر تقلید واجب ہے۔

حضرت امام غزالی رح فرماتے ہیں،

بل علی کل مقلد اتباع مقلدہ فی کل تفصیل فاذن مخالفتہ للمقلد متفق علی کونہ منکراً بین المحصلین[4]	بل کہ ہر مقلد پر اپنے متبوع کی تقلید واجب ہے تمام تفاصیل کے اندر علماء کے نزدیک متبوع کی مخالفت بالاتفاق جائز نہیں ہے۔

علامہ ابن قیم رح فرماتے ہیں:

وقال ابن احمد سألت عن الرجل	امام احمد رح کے صاحبزادے فرماتے ہیں۔ میں نے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ ۳۶۲ ج ۱، [2] عقد الجید صـ ۹،

[3] مدار الحق صـ ۳۱۵، [4] احیاء العلوم صـ ۳۲۱ ج ۲،

يكون عنده الكتب المصنفه فيها قول رسول الله صلى الله عليه وسلم والصحابه والتابعين وليس للرجل بصيرة بالحديث الضعيف والمتروك والاسناد القوى من الضعيف فيجوز ان يعمل بما شاء ويتخير منها فيفتى به و يعمل به قال لا يعمل حتى يسأل ما يوخذ به فيكون يعمل على امر صحيح يسأل من ذلك اهل العلم۔[1]

امام احمد رحؒ سے ایسے آدمی کے بارے میں سوال کیا جس کے پاس تصنیف شدہ کتابیں ہیں جن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضؓ اور تابعین کے اقوال ہیں۔ لیکن اس آدمی کو حدیث ضعیف، متروک اور اسناد قوی اور ضعیف کی معرفت نہیں ہے تو کیا اسکے لئے جائز ہے جس چیز پر چاہے عمل کرے اور اختیار کرے اور اس کے مطابق فتوی دے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ قابل اخذ چیزوں کے بارے میں سوال کئے بغیر عمل نہیں کرسکتا۔ اہل علم سے معلوم کرکے امر صحیح ہی پر عمل کرسکتا ہے۔

حقیقت تقلید

گذشتہ مباحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہوگئی کہ تقلید کی حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔۔ کہ ایک مجتہد کو کتاب وسنت کا واقف اور نکتہ داں سمجھ کر اس سے رہنمائی حاصل کی جائے، بذات خود وہ نہ تو واجب الاتباع ہے، نہ شریعت ساز۔ تقلید کی یہ حقیقت تقلید کے لغوی اور اصطلاحی معانی سے بھی بخوبی اخذ کی جاسکتی ہے۔

تقلید کی لغوی تحقیق

تقلید کے معانی لغت میں "کسی شی کو دوسری شی کے لئے لازم کردینا ہے"۔

المعجم الوسیط میں ہے: "قلد فلانا الامر او العمل فوضه اليه والزمه اياه۔"[2]

---

[1] اعلام الموقعین بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن ص ج ۲،

[2] المعجم الوسیط ص ۷۵۴۔

صاحب صراح فرماتے ہیں :

" یقال قلده العمل کار در عہدہ کسے کردن "[۱]

تقلید کا اصطلاحی مفہوم

مشہور غیر مقلد عالم مولانا نذیر حسین رح تقلید کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

" معنی تقلید کے اصطلاح میں اہلِ اصول کی یہ ہے کہ مان لینا اور عمل کرنا ساتھ قول بلا دلیل اس شخص کے جس کا قول حجت شرعی نہ ہو "[۲]

صاحب نامی شرح حسامی فرماتے ہیں :

" التقلید اتباع الغیر علی ظن انه محق بلا نظر فی الدلیل "[۳]

مولانا قاضی محمد اعلیٰ صاحب تھانوی رح فرماتے ہیں :

التقلید اتباع الانسان غیرہ فیما یقول او یفعل معتقداً للحقیة من غیر نظر الی الدلیل کان ھذا المتبع جعل قول الغیر او فعله قلادة فی عنقه من غیر مطالبة دلیل[۴]

تقلید انسان کا اپنے غیر کی اتباع کرنا اس کے قول یا فعل میں اسے حق سمجھتے ہوئے دلیل پر نظر کئے بغیر گویا کہ اس متبع نے غیر کے قول یا فعل کو اپنی گردن کا ہار بنا لیا ہے بلا کسی دلیل کے مطالبے کے۔

مسلم الثبوت میں ہے :

" التقلید العمل بقول الغیر من غیر حجة "[۵]

حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب محدث رح تعریف مذکور میں " من غیر حجة " کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں " یعنی من غیر حجة " کی مراد انتفاء حجت نہیں ہے' اس کی توضیح یہ ہے کہ ایک تو کسی بات کو یوں ماننا ہوتا ہے کہ ماننے والا یہ جانتا ہو کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسری

---

[۱] صراح باب الدال ص ۱۳۴ ، — [۳] معیار الحق ص ۲۵ [۴] کشاف اصطلاحات الفنون ص ۱۱۷۸ ،

[۲] معیار الحق ص ۲۵ ، [۵] " " "

[۳] نامی ص ۱۹۰ ،

شکل یہ ہوتی ہے کہ ماننے والے کو اس بات کی دلیل کا علم نہ ہو، چاہے واقع میں اس کی دلیل موجود ہو۔ یہی دوسری شکل انتفائے علم حجت کی ہے۔ اور یہی تقلید کا مفہوم ہے۔ جو مسلم الثبوت کے مذکورہ فقرے میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ علامہ سبکی رح نے جامع الجوامع میں اس کو بالکل صاف کر دیا ہے۔

فرماتے ہیں: ھو اخذ القول من غیر معرفۃ دلیلہ۔ اور وہ مجتہد کے قول کو قبول کرنا اس کی دلیل جانے بغیر۔ اسی کو دوسرے عنوان سے تفتازانی نے ایک مقام پر ضمناً ذکر کیا ہے کہ مقلد جن احکام کو تسلیم کرتا ہے وہ احکام بلا دلیل نہیں ہوتے بلکہ یہ بات ہوتی ہے کہ مقلد کو ان کا علم دلائل میں غور و فکر کرنے سے حاصل نہیں ہوا ہے" حینئذ لا یخرج علم المقلد لانہ علم بالاحکام الحاصلۃ عن ادلتہا التفصیلیۃ وان لم یکن علم المقلد حاصلاً من الادلۃ۔ (تلویح ص۲۶)

بہرحال صاحب مسلم الثبوت کے نزدیک تقلید اس کا نام ہے کہ کسی قول کی دلیل نہ معلوم ہو اور اسکو مان لیا جائے ...... شاہ صاحبؒ نے اسی من غیر حجۃ کے مفہوم کو پھیلا کر ان الفاظ میں بیان کیا ہے "لکن لما لم یکن لہ علم بما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وبطریق الجمع"۔ ؎ (حجۃ اللہ البالغہ)

ان تمام اقوال سے تقلید کا حاصل یہی نکلا کہ قرآن و حدیث کے علوم تک براہ راست رسائی نہ رکھنے والا انسان کسی راسخ فی العلم مجتہد کے واسطے سے ان کی اتباع کرے اور اس مجتہد کو شارع نہیں بلکہ شریعت تک پہنچنے کا واسطہ اور ذریعہ قرار دے۔

تقلید کی دو صورتیں

تقلید کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تقلید کے لیے کسی خاص امام اور مجتہد کو متعین کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلہ میں کسی عالم کا مسلک اختیار کیا گیا ہے تو دوسرے میں کسی دوسرے عالم کی رائے اختیار کر لی جائے اس کو تقلید غیر معین یا تقلید مطلق یا تقلید غیر شخصی کہتے ہیں

اور دوسری صورت یہ ہے کہ تمام مسائل میں کسی ایک ہی مجتہد عالم کی تقلید کی جائے جس کو تقلید معین اور تقلید شخصی کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے دونوں ہی کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

؎ مکتوب حضرت مولانا رہ مطبوعہ المآثر ربیع الآخر، جمادی الاول و جمادی الآخر ص۹۴-۹۵۔

تقلید کا وجوب قرآن کریم سے

پہلی آیت سورۃ نحل اور سورۃ انبیاء کی ہے۔ فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون، اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو علم وتحقیق میں ماہر نہ ہو اصولی طور پر ہدایت دی ہے کہ وہ اہل علم سے معلوم کرتے رہیں۔ یعنی اہل علم سے رجوع ان کے لئے لازم ہے اسی چیز کو تقلید کہتے ہیں۔ علامہ آلوسی تحریر فرماتے ہیں؛

" واستدل بها ایضًا علی وجوب المراجعة للعلماء فیما لایعلم[1]	اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جس چیز کا خود علم نہ ہو اس میں علماء سے رجوع کرنا واجب ہے۔

آیت مذکورہ میں "اھل ذکر" کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے اس کی تشریح کرتے ہوئے صاحب مدار الحق رح فرماتے ہیں؛

فالآیة تدل علی اتباع اھل الذکر لکن جمیع افراد اھل الذکر غیر مراد باجماع الامة ...... فاذا کان جمیع افراد اھل الذکر غیر مراد فیحمل علی الفرد الکامل لا لناقص لانه المتیقن ولان المطلق یحمل علی الفرد الکامل غالبًا ...... فلا من حمله علی الفرد الکامل ای الاھلیة الکاملة ولانه مطلق محمول علی المقید وھو قوله تعالیٰ واتبعوا احسن ما انزل الیکم من	تو آیت دلالت کرتی ہے اہل ذکر کے اتباع پر۔ لیکن اس پر اجماع ہے کہ تمام اہل ذکر مراد نہیں ہیں۔ تو جب تمام اہل ذکر مراد نہیں ہیں تو اہلِ ذکر کو فرد کامل پر محمول کیا جائے گا کیوں کہ وہ متیقن ہیں۔ اور اس بناء پر بھی کہ مطلق عمومًا فرد کامل پر محمول کیا جاتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ فرد کامل مراد لیا جائے یعنی مکمل اہل ہونا اور اس بنا پر بھی کہ یہ مطلق مقید پر محمول ہے اور وہ مقید اللہ تعالیٰ کا قول واتبعوا الخ اتباع کرو اس چیز کے احسن پر جو تمہارے رب نے تمہارے لئے نازل کی۔ تو اس آیت کا مدلول

---

[1] روح المعانی ص۱۴۸ ج ۱۴۔

ربکم فان مدلوله الفرد الکامل من الکل کما سیاتی فذلك کاف فی الاستدلال علی الوجوب فانه مما ثبت بالدلیل الظنی۔

مجموعے میں سے فرد کامل ہے جیسا کہ اس کی تشریح آئے گی۔ الحاصل اتنی بات وجوب پر استدلال کرنے کے لیئے کافی ہے۔ کیونکہ وجوب دلیل ظنی سے ثابت ہوتا ہے۔

دوسری آیت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"واتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم"

تابعداری کرو تم ان احسن احکام کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارے گئے ہیں۔

صاحب مدار الحق رح فرماتے ہیں:

فالأیة نص صریح فی وجوب اتباع احسن ما انزل الینا من ربنا هو احکام الفرد الکامل وبیان ذلك الاجمال ان المجتهد مظهر کلام اللّٰه تعالیٰ لا مثبت عند اهل السنة لان الحاکم هو اللّٰه تعالیٰ وحده بالاجماع لقوله تعالیٰ ان الحکم الا للّٰه.... فاذا کان المجتهد مظهراً لا مثبتا کان احکامه ثابتة بالنص ولو معنا کما صرح به العلامة التفتازانی فی شرح العقائد حیث قال والثالث ان القیاس مظهر لا مثبت فان الثابت بالقیاس ثابت بالنص معنی انتهی وبیانه ان احکام المجتهدین علی

تو آیت نص صریح ہے ان احسن احکام کے اتباع کے وجوب میں جو ہماری طرف ہمارے رب نے اتارے اور یہ فرد کامل کے احکام ہیں اس کی وضاحت یہ ہے کہ مجتہد اہل سنت کے نزدیک اللہ کے حکم کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ ثابت کرنے والا۔ اس لیے کہ ثابت کرنے والی ذات تو بالاجماع صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔ تو جب ثابت ہوا کہ مجتہد صرف مظہر ہوتا ہے نہ کہ مثبت۔ تو اس کے احکام معنی ثابت بالنص قرار دیئے جائیں گے جیسا کہ علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں اس کی وضاحت کی ہے کہ قیاس مظہر ہوتا ہے نہ کہ مثبت۔ پس ثابت بالقیاس معنی ثابت بالنص ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ احکام

قسمین قسم ثابت بالنص وقسم ثابت بالقیاس ولکن لما کان القیاس تعدیۃ الحکم من الاصل الی الفرع لاتحاد العلۃ کان الثابت بالقیاس ثابتا بالنص معنیً فاذا کان احکامہ ثابتۃ بالنص ولو معنی ولاشک فی ان الاحکام المستخرجۃ بقوۃ الفرد الکامل احسن من الاحکام المستخرجۃ بقوۃ غیرہ کان الاحکام المستخرجۃ بقوۃ الفرد الکامل احسن ما انزل فلما کانت الاٰیۃ تدل علی وجوب اتباع احسن ما انزل وکانت الاحکام المستخرجۃ بقوۃ الفرد الکامل احسن من احکام المستخرجۃ وبقوۃ غیرہ۔ دلت علی اتباع الفرد الکامل من الکل فوجب علی المقلد اتباع مذھب الفرد الکامل بدلالۃ الکتاب لاریب فیہ[1]

مجتہدین دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) ثابت بالنص (۲) ثابت بالقیاس۔ لیکن جب قیاس نام اتحاد علت کی بناء پر حکم کا اصل سے فرع کی طرف متعدی ہونا ہے تو ثابت بالقیاس گویا کہ ثابت بالنص ہوا۔ تو جب مجتہد کے احکام معنی کے اعتبار سے ثابت بالنص کی طرح ہوئے تو اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ احکام جو فرد کامل کی قوت سے مستنبط کیے گئے ہیں، ان احکام سے احسن ہیں جو فرد کامل کے غیر کی طرف مستنبط کئے گئے ہوں، ساتھ ساتھ فرد کامل کی جانب سے مستنبط کئے ہوئے احکام احسن ما انزل کے درجہ میں ہوئے اور آیت میں اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ کی اتباع کے وجوب پر دلالت ہے تو لازمی طور سے اس آیت کی رو سے فرد کامل کے مستنبط کئے ہوئے احکام کی اتباع واجب ہوئی (اور یہی تقلید ہے)۔

تیسری آیت

سورہ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ

اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اس کی اشاعت کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس معاملے کو رسول کی

---

[1] مدار الحق ص ۳۴، ۳۵۔

الذین یستنبطونہ منھم۔

طرف یا اپنے اولو الامر کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں. وہ اس (کی حقیقت) کو خوب معلوم کر لیتے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں؛

فثبت ان الاستنباط حجۃ والقیاس اما استنباط اوداخل فیہ فوجب ان یکون حجۃ اذا ثبت ھذا فنقول الآیۃ دالۃ علی امور احدھا ان فی احکام الحوادث مالا یعرف بالنص بل بالاستنباط وثانیھا ان الاستدلال حجۃ وثالثھا ان العامی یجب علیہ تقلید العلماء فی احکام الحوادث[1]

پس ثابت ہوا کہ استنباط حجت ہے اور قیاس یا تو بذات خود استنباط ہوتا ہے یا اس میں داخل ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی حجت ہوا جب یہ بات طے ہو گئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے. ایک یہ کہ نت نئے پیش آنے والے مسائل میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں جو نص سے (صراحۃً) معلوم نہیں ہوتے. بلکہ ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے استنباط کی ضرورت پڑتی ہے۔ دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے۔ تیسرے یہ کہ عامی آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل واحکام کے بارے میں علماء کی تقلید کرے۔

امام ابوبکر الجصاص رازی رح فرماتے ہیں؛

فقد حدث ھذہ الآیۃ معانی منھا ان فی احکام الحوادث مالیس بمنصوص علیہ بل مدلول علیہ ومنھا ان علی العلماء استنباطہ والتوصل الی معرفتہ بردہ الی نظائرہ من المنصوص ومنھا ان العامی علیہ تقلید العلماء

یقیناً یہ آیت کریمہ متعدد معانی ومطالب پر مشتمل ہے. ایک یہ کہ پیش آمدہ مسائل کے احکام ایسے بھی ہیں جو صراحۃً ثابت نہیں بلکہ دلیل سے ان کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور دوسرا یہ کہ علماء پر ان کا استنباط اور منصوص نظائر کی طرف لوٹا کر ان کی معرفت تک رسائی

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۳۔

فی احکام الحوادث [1] | لازم ہے۔ اور تیسرا یہ کہ عامی پر پیش آمدہ مسائل میں علماء کی تقلید لازم ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی فرماتے ہیں کہ:

"ہاں یہ بات ضروری ہے کہ استنباط کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے اور اس کے شروط بھی ہیں اور استنباط کو فقہا قیاس بھی کہتے ہیں۔ پس جو استنباط نہ کرسکتا ہو اسکو اس مسئلہ میں جو اسکو کتاب وسنت واجماع میں نہ ملے تو مستنبط یعنی مجتہد سے پوچھ کر اس پر عمل کرنا چاہیئے اور اسی کو تقلید شرعی کہتے ہیں جس کی ضرورت سمجھی گئی" [2]

چوتھی آیت سورہ نساء میں اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ | اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالٰی نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ساتھ "اولوالامر" کی اطاعت بھی واجب قرار دی ہے "اولوالامر" کی تفسیر میں بعض علماء نے تو یہ فرمایا ہے کہ اس سے مراد مسلمان حکام ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد فقہاء ہیں۔ یہ دوسری تفسیر حضرت جابر بن عبداللہ رضہ حضرت عبداللہ بن عباس رضہ حضرت مجاہد رحہ حضرت عطاء بن ابی رباح حضرت عطاء بن السائب سے منقول ہے۔ اور امام رازی رحہ نے اسی تفسیر کو متعدد دلائل کے ذریعہ ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اس آیت میں لفظ اولوالامر سے علماء مراد لینا اولٰی ہے" [3]

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی رحہ تحریر فرماتے ہیں:

وقال جابر بن عبد اللّٰہ ومجاھد | حضرت جابر بن عبداللہ رضہ اور مجاہد رحہ کے

---

[1] احکام القرآن ص۲۱۵ ج۲ ، [2] تفسیر حقانی ص۲۵ ج۵

[3] بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت ص۱۶ ۔

"اولوالامر" اهل القرآن والعلم وهو اختيار مالك ونحوه قول الضحاك قال يعني الفقهاء والعلماء في الدين وحكي عن مجاهد انهم اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم خاصة وحكي عن عكرمه انها اشارة الى ابي بكر وعمر رضي الله عنهما خاصة [1]

نزدیک "اولوالامر" سے مراد اہل القرآن والعلم ہیں اسی کو امام مالک رح نے اختیار کیا ہے اور اسی جیسا ضحاک رح کا قول ہے کہ فقہاء اور علمائے دین مراد ہیں۔ مجاہد رح سے مروی ہے کہ وہ خصوصاً اصحاب رض محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور عکرمہ سے منقول ہے کہ اس سے مراد خاص طور پر حضرت ابو بکر رض اور حضرت عمر رض ہیں۔

ان اقوال اور تشریحات سے ثابت ہوا کہ اولوالامر یعنی اہل قرآن، اہل حدیث، فقہاء، صحابۂ کرام رض یا بعض قول کے اعتبار سے حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت اور اتباع واجب ہے اور اس کی اتباع اور اطاعت ہی کا دوسرا نام تقلید ہے۔

اگر دوسری تفسیر کے اعتبار سے "اولوالامر" سے مراد حکام لیے جائیں تو ان کی اطاعت بھی علماء ہی کی اطاعت کے تابع ہے۔

نواب صدیق صاحب فرماتے ہیں،

والتحقيق ان الامراء انما يطاعون اذا امروا بمقتضى العلم فطاعتهم تبع لطاعة العلماء كما ان طاعة العلماء تبع الطاعة اطاعة الرسول [2]

تحقیق یہ ہے کہ امراء اور حکام کی اطاعت تب ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ علم شریعت کے مطابق فیصلہ کریں تو امراء کی اطاعت علماء کی اطاعت کے تابع ہے جیسا کہ علماء کی اطاعت جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے تابع ہے۔

اسی آیت کا اگلا جملہ ہے۔

فان تنازعتم في شيءٍ فردّوه الى الله

پس اگر کسی معاملے میں تمہارا اختلاف ہو جائے

---

[1] تفسیر القرطبی ص ۲۵۱ ج ۳۔

[2] الجنۃ ص ۲ بحوالہ الکلام المفید ص ۱۲۔

والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر۔

تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو

• یہ مستقل جملہ ہے اس میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے، آیت کے اس حصے سے بھی ثابت ہوتا ہے "اولوالامر" کی تفسیر علماء ہی سے کرنا زیادہ مناسب ہے۔

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

(قولہ تعالیٰ عقیب ذلک فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول یدل علی ان اولی الامر ھم الفقہاء لانہ امر سائر الناس بطاعتھم ثم قال فان تنازعتم الخ فامر اولی الامر برد المتنازع فیہ الی کتاب اللہ وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم واذ کانت العامۃ ومن لیس من اھل العلم لیست ھذہ منزلتھم لانھم لا یعرفون کیفیۃ الرد الی کتاب اللہ والسنۃ ووجوہ دلائلھا علی احکام الحوادث فثبت انہ خطاب للعلماء[1]

اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسول ؐ کی طرف لوٹا دو۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اولوالامر سے مراد فقہاء ہیں کیوں کہ اللہ نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا پھر فان تنازعتم فرما کر "اولوالامر" کو حکم دیا کہ جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہو تو اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف لوٹا دو۔ یہ حکم فقہاء ہی کو ہو سکتا ہے کیوں کہ عوام الناس اور غیر اہلِ علم کا یہ مقام نہیں ہے اس لیے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور نہ انہیں نت نئے مسائل مستنبط کرنے کے لیے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ یہ خطاب علماء کو ہے۔

---

[1] احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۵۷۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں :

واما القول الثانی فیدل علی صحتہ قولہ تعالیٰ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللّٰہ والرسول فامر تعالیٰ برد المتنازع فیہ الی کتاب اللّٰہ وسنۃ نبیہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ولیس لغیر العلماء معرفۃ کیفیۃ الرد الی الکتاب والسنۃ ویدل ھٰذا علی صحۃ کون سوال العلماء واجبًا وامتثال فتواھم لازمًا [1]

بہر حال قول ثانی کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا قول فان تنازعتم اگر تم اختلاف کرو کسی چیز میں تو اس کا معاملہ اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ، اس میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ متنازع فیہ معاملہ کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف لے جاؤ اور غیر عالم کو کتاب وسنت کی طرف لوٹانے کی کیفیت کا علم نہیں ہوتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علماء سے سوال کرنا واجب اور ان کے فتوے کو تسلیم کرنا لازم ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

وکذالک یشتمل الفقہاء والعلماء والمشائخ بل اولی لانھم ورثۃ الانبیاء وحازنوا احکام اللّٰہ واحکام رسولہ اخرج ابن جریر والحاکم وغیرھما عن ابن عباس ھم اھل الفقہ والدین وفی لفظھم اھل العلم وابن ابی شیبہ والحاکم وصححہ وغیرھما، عن جابر بن عبداللّٰہ نحوہ وعن ابی العالیہ ومجاھد کذالک وقال اللّٰہ تعالیٰ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین

ایسے ہی یہ علماء، فقہاء اور مشائخ کو شامل ہے بلکہ یہ حضرات اولیٰ ہیں کیوں کہ یہی انبیاء علیہم السلام کے وارث اور احکام خدا اور رسول کے حامل ہیں۔ ابن جریرؒ اور حاکم وغیرہ نے ابن عباس رضؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اہل الفقہ والدین ہیں اور دوسری روایت کے اعتبار سے یہ "اہل علم" ہیں۔ ابن شیبہ اور حاکم وغیرہ نے جابر بن عبداللہ سے اس کے مثل بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور ابو العالیہؒ اور مجاہدرہ سے بھی یہی منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اگر یہ

---

[1] تفسیر القرطبی، ص ٢٦٠، جلد ٣

یستنبطونه منهم وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم العلماء ورثة الانبیاء. رواه احمد والترمذی وابوداود وابن ماجه من حدیث کثیر بن قیس وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم للصحابة رضوان الله علیهم اجمعین الناس لکم تبع وان رجالاً یاتونکم من اقطار الارض یتفقهون فی الدین رواه الترمذی عن ابی سعید خذری ؎

کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولوالامر کی طرف لوٹاتے تو ان میں سے مسائل کی تہ تک پہونچنے والے لوگ اس کو معلوم کر لیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' علماٗ انبیاء کے وارث ہیں۔ اس حدیث کو احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے کثیر بن قیس کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ لوگ تمہارے تابع ہیں اور بے شک کچھ لوگ زمین کے اطراف سے تمہارے پاس فقہ فی الدین کی تعلیم حاصل کرنے آئیں گے۔ اسے ترمذی نے ابو سعید خذری سے روایت کیا ہے۔

پانچویں آیت سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون

پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں۔

آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ تمام ہی مسلمانوں کو جہاد وغیرہ دیگر کاموں میں مصروف نہ ہو جانا چاہئے بلکہ ایک جماعت تو ایسی ضرور ہونی چاہئے جو اپنے آپ کو تفقہ فی الدین کے لیے یکسو کرے اور انہیں حضرات کے ذمے ہے کہ اپنے کم علم بھائیوں کو احکام شریعت بتلائیں اور کم علم حضرات پر لازم ہے کہ اپنے اہل علم افراد کی اتباع کریں تاکہ اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رہ سکیں۔ اسی اتباع کو بلفظ دیگر تقلید کہتے ہیں۔

؎ تفسیر مظہری ص ۱۵۲۔

امام ابوبکر جصاص رح فرماتے ہیں :

فاوجب الحذر بانذارهم والزم المنذرين قبول قولهم[1]

پس اللہ تعالٰے نے عام لوگوں پر واجب کیا کہ علماء کے آگاہ کرنے کے بعد ہوشیار ہو جائیں اور ان کے قول کو تسلیم کریں۔

یہ چند آیات ہیں جن سے نفس تقلید کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اب اسی سلسلہ میں چند احادیث پیش کی جاتی ہیں

تقلید کا وجوب احادیث سے

ترمذی میں حضرت عرباض رضؓ بن ساریہ کی روایت سے ایک طویل حدیث منقول ہے، جس میں حضورؐ کا ارشاد ہے :

(۱) من يعش منكم بعدي يرى اختلافا كثيرا واياكم ومحدثات الامور فانها ضلالة فمن ادرك ذالك منكم فعليه بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ[2] (هذا حديث صحيح)

تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلاف دیکھے گا تم نوایجاد چیزوں سے پرہیز کرنا اسلئے کہ وہ گمراہی ہیں، تو تم میں کا جو آدمی بھی ان فتنوں کو پائے وہ میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑے اور اسے اپنی داڑھوں سے مضبوط جکڑ لے۔

اس روایت میں کس اہتمام بلیغ کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنتوں کے ساتھ ساتھ خلفاءِ راشدین کی سنتوں کو اختیار کرنے کا حکم فرما رہے ہیں۔ اپنے ان مبارک الفاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد آنے والے تمام لوگوں پر خلفائے راشدین کی تقلید واجب فرما دی۔

(۲) عن حذيفة قال كنا جلوسا عند النبي صلى الله عليه وسلم فقال اني لا ادري ما بقائي فيكم فاقتدوا بالذين من بعدي واشار الى ابي بكر وعمر[3]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا مجھے نہیں معلوم، میں کب تک تمہارے درمیان رہوں تم میرے بعد

---

[1] احکام القرآن للجصاص ص ۲۶۲/۲ ، [2] ترمذی ص ۹۲/۲ ، [3] ترمذی باب المناقب ص ۲۰۷/۲ ۔

دو شخصوں کی اقتدا کرنا اور آپ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ فرمایا۔

اس حدیث میں ایک بات بطور خاص قابل غور ہے۔ یہاں "اقتداء" کا لفظ استعمال ہوا جو عموماً انتظامی امور نہیں بلکہ دینی امور میں کسی کی اطاعت اور پیروی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

اولئك الذين هدى الله فبهدىٰهم اقتده (انعام - ۹۰) — یہی لوگ جن کو اللہ نے ہدایت دی پس تم ان کی ہدایت کی اقتداء کرو۔

صحیح بخاری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے واقعہ میں ہے:

يقتدى ابوبكر بصلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم والناس مقتدون بصلوٰة ابى بكرؓ [1] — حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکرؓ کی نماز کی اقتدا کر رہے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ بے شمار نصوص ہیں "اقتداء" دینی امور میں کسی کی اتباع اور پیروی کے لیے آتا ہے۔ اس لئے پیش کردہ حدیث کا مقصد دینی امور میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقتداء کا حکم دینا ہے اور اسی کا نام تقلید ہے۔

(۳) مسند احمد میں حضرت سہل بن معاذ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

ان امرأة اتته فقالت يا رسول الله انطلق زوجي غازيًا وكنت اقتدى بصلوٰته اذا صلى وبفعله فاخبرني بعمل يبلغني عمله حتى يرجع [2] — ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا شوہر جہاد کے لئے چلا گیا ہے اور جب وہ نماز پڑھتا تھا تو میں اس کی پیروی کرتی تھی اور اس کے تمام افعال کی اقتدا کرتی تھی اب آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے اس کے عمل کے برابر پہنچا دے یہاں تک کہ وہ لوٹ کر آجائے۔

---

[1] بخاری ص ۹۹ ج ۱۔ [2] مسند احمد ج ۳ ص ۴۳۹ بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت ص ۳۲۔

یہاں اس عورت نے صاف طور سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا میں اپنے شوہر کی نماز اور اس کے علاوہ شوہر کے تمام افعال میں اس کی اقتدا کرتی ہوں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔

(۴) عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض یقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسا جهالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا[۱]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ علم کو اللہ تعالیٰ اس طرح نہیں اٹھائیں گے کہ اسے بندوں کے دل سے سلب کرلیں، بلکہ علم اس طرح اٹھائیں گے کہ علماء کو اپنے پاس بلالیں گے. یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ چھوڑے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، ان سے سوالات کئے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اس حدیث میں واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ مسائل علمیہ بتلانا، فتوے دینا، یہ صرف علماء کا کام ہے ہر کس وناکس کا یہ منصب نہیں جو حضرات مرتبہ علم پر فائز نہیں ہیں وہ ان تمام امور دینیہ اور مسائل شرعیہ میں علماء ہی کی طرف رجوع اور انہیں کی تقلید کے محتاج ہیں. اور یہی جادۂ حق اور راہ خیر ہے. اس کے برعکس جب غلبہ شر کا زمانہ آئے گا تو علماء مفقود اور جہلاء جلوۂ محراب و منبر ہوں گے۔ اور بالکل یہ صورت حال ہوگی ؎

پری نہفتہ رخ و دیو با کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجی است

یہ جہلاء ہی لوگوں کے مقتداء مفتی اور مجتہد بن بیٹھیں گے جو خود بھی سراپا زیغ وضلال ہوں گے اور دوسروں کو بھی راہ ہدایت سے دور کردیں گے۔

---

[۱] بخاری کتاب العلم صن۲ ج ۱۔ ترمذی ابواب العلم ص۹۰ ج ۲۔ مسند حمیدی ص۲۶۵ ج ۱۔

علماء اگر موجود نہ ہوں تو گذرے ہوئے علماء کی تقلید کیجائے

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس دور میں احکام شریعت پر عمل کرنے کے سوائے اس کے اور کیا صورت ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ گذرے ہوئے علماء کی تقلید کریں کیوں کہ جب زندہ لوگوں میں کوئی عالم نہیں بچا تو نہ کوئی شخص براہ راست قرآن وسنت سے احکام اخذ کرنے کا اہل رہا اور نہ کسی زندہ عالم کی طرف رجوع کرنا اس کی قدرت میں رہا کیوں کہ کوئی عالم موجود ہی نہیں۔ لہٰذا احکام شریعت پر عمل کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ جو علماء وفات پا چکے ہیں ان کی تصانیف وغیرہ کے ذریعہ ان کی تقلید کی جائے۔ لہٰذا یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب تک علماء اہل اجتہاد موجود ہوں اس وقت تک ان سے مسائل معلوم کئے جائیں اور ان کے فتوؤں پر عمل کیا جائے۔ اور جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے تو نا اہل لوگوں کو مجتہد سمجھ کر ان کے فتوؤں پر عمل کرنے کے بجائے گذشتہ علماء میں سے کسی کی تقلید کی جائے ورنہ آدمی کا دین محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(۵) ابراهيم ابن عبد الرحمٰن العذری قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين (رواه البيهقی فی کتاب المدخل مرسلاً[۱])

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر آنے والی نسل کے ثقہ لوگ اس علم دین کے حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف اور اہل باطل کے جھوٹے دعوؤں اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔

اس حدیث میں اہل علم کا کار منصبی بتلایا گیا ہے کہ وہ جاہلوں کی تاویلات سے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ تو ثابت ہوا کہ جہلاء کو تاویل دین کا ہرگز حق نہیں، یہ صرف علماء ہی کی شان ہے۔ تو ان حضرات کے لئے صرف یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ علماء کی اتباع اور کتاب وسنت سے اخذ مسائل کے سلسلہ میں اہل علم ہی کی تقلید کریں۔

(۶) عن جابر قال خرجنا فی سفر فاصاب رجلاً منا حجرٌ فشجه فی راسه

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ سفر میں تھے۔ ہم میں سے ایک آدمی کو

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۶۔

فاحتلم فسأل اصحابه هل تجدون لی رخصة فی التیمم قالوا مانجد لک رخصة وانت تقدر علی الماء فاغتسل فمات فلما قدمنا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبرنا بذالک قال قتلوہ قتلھم اللہ الا سألوا اذلم یعلموا فانما شفاء العی السوال ....

(رواہ ابوداؤد ورواہ ابن ماجہ عن عطاء بن ابی رباح عن ابن عباس)[۱]

پتھر لگ گیا جس نے اس کے سر کو زخمی کر دیا۔ اس حالت میں ان صاحب کو احتلام ہو گیا انہوں نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا تم لوگ میرے مسئلہ میں کچھ رخصت پاتے ہو۔ ان لوگوں نے کہا ہم آپ کے لئے کوئی رخصت نہیں پاتے کیوں کہ تم پانی پر قادر ہو۔ چنانچہ انہوں نے غسل کر لیا جس کی وجہ سے ان کی موت ہو گئی۔ واپس آکر یہ ماجرا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اللہ انہیں سمجھے ان لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ جب مسئلہ نہیں جانتے تھے تو کیوں نہیں معلوم کر لیا۔ سوال ہی تو درماندگی کی شفا ہے۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا جنہوں نے نہ جاننے کے باوجود بھی اہل علم سے سوال کرنے میں پہلوتہی کی۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ کسی مسئلہ شرعیہ کے صحیح ادراک سے قاصر ہوں، ان کے مرض جہل کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اہل علم سے سوال کریں بعینہٖ یہی چیز تقلید ہے۔

(۷) عن ابن سیرین قال ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم[۲]

(رواہ مسلم)

ابن سیرین فرماتے ہیں بے شک یہ علم دین ہے تو یہ دیکھ لو کہ تم اپنا دین کن سے حاصل کرتے ہو۔

ثابت ہوا کہ ہر آدمی ایسا نہیں کہ جس سے دین حاصل کیا جائے بلکہ اس کے لئے مخصوص اہل علم واہل دیانت حضرات ہیں۔ صرف اہل علم ہی سے دین حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ حضرات انھیں کے تابع اور مقلد ہوں گے۔

---

۱ مشکوۃ باب التیمم ص۵۴-۵۵۔

۲ مشکوۃ کتاب العلم ص۳۷۔

تقلید اور اتباع ایک ہی چیز ہے

یہاں یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ بعض حضرات زور وشور کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تقلید اور چیز ہے اور اتباع اور ہے۔ ان حضرات کا یہ کہنا ہے کہ قرآن وحدیث سے جس چیز کا ثبوت ہے وہ اتباع ہے اور وہی محمود اور مطلوب ہے اور ہم اتباع سلف کے مامور ہیں۔ اس کے برخلاف تقلید کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ وہ مذموم اور ممنوع ہے۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری (المتوفی ۱۹۴۸ء) تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارا اعتقاد ہے کہ ہم اتباع سلف کے مامور ہیں تقلید کے مامور نہیں۔ تقلید اور اتباع میں بہت فرق ہے۔ تقلید محض قول بلا معرفت دلیل کے قبول کرنے کا نام ہے اور اتباع علی وجہ البصیرت قبول کرنے کا نام ہے۔" [1] (ملاحظہ ہو اعلام الموقعین ص ۲۸۵)

اس کے جواب میں اولاً لفظ "اتباع" کی تحقیق عرض کی جاتی ہے۔ ارباب لغت لکھتے ہیں:

يقال تبعه واتبعه قفا اثره، وذالك تارة بالارتسام والائتمار [2]
کہا جاتا ہے "تبعه واتبعه" اس کے نقش قدم کو اختیار کیا اور یہ اتباع بعض دفعہ نقش قدم اختیار کرنے اور حکم بجا آوری کی شکل میں ہوتا ہے۔

اتبع الشئ سار وراءه، ويقال اتبع الامام حذا حذوه [3]
کہا جاتا ہے "اتبع الشی" کے پیچھے چلا اور کہا جاتا ہے "تبع الامام" امام کی مکمل تقلید کی۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

الاتباع سلوك طريق المتبع والاتيان بمثل ما اتى به [4]
اتباع متبوع کے راستے کو اختیار کرنا ہے اور وہی کرنا ہے جو متبوع نے کیا۔

ان وضاحتوں سے یہ چیز بالکل مبرہن ہوگئی کہ "اتباع" اور تقلید بعینہ ایک ہی شئی ہیں۔ چنانچہ علماء بعض دفعہ تقلید کی تعریف ہی لفظ "اتباع" سے کرتے ہیں۔

---

[1] تقلید شخصی وسلفی ص ۴۲ بحوالہ الکلام المفید، [2] معزدات امام راغب ص ۷۳ وبصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب ص ۲۹۳۔ [3] المعجم الوسیط ص ۸۱،

[4] مقدمہ اعلاء السنن ص ۹ ج ۲۔

حضرت مولانا قاضی محمد اعلیٰ صاحب رح فرماتے ہیں ،

التقلید اتباع الانسان غیرہ فیما یقول او یفعل [1] الخ — تقلید انسان کا اپنے غیر کا اتباع کرنا ہے اسکے قول اور فعل کے اندر۔

علامہ ابن مالک رح اور ابن العینیؒ فرماتے ہیں ؛

وھو عبارۃ عن اتباعہ قولہ وفعلہ معتقداً للحقیۃ من غیر تامل فی الدلیل [2] — تقلید دوسرے کے قول اور فعل میں اس کی اتباع کا نام ہے یہ اعتقاد کرتے ہوئے کہ وہ حق ہے بغیر اس کے کہ دلیل کی فکر میں پڑے۔

علامہ عبدالحق حقانی رح فرماتے ہیں ؛

التقلید اتباع الغیر علی ظن انہ محق بلا نظر فی الدلیل [3] — تقلید غیر کی اتباع کرنا ہے یہ خیال کرکے کہ وہ حق پر ہے دلیل پر نظر کیے بغیر۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رح ولا تتبعوا من دونہ اولیاء کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ؛

خرج بقولہ من دونہ من کانت ولایتہ من جھۃ اللہ تعالیٰ کالانبیاء والعلماء [4] — اللہ تعالیٰ کے قول "من دونہ" سے وہ لوگ نکل گئے جن کی ولایت منجانب اللہ ہے جیسے انبیاء اور علماء۔

ثابت ہوا کہ علمائے شریعت کی تقلید بھی "اتباع ما انزل اللہ" کے درجے میں ہے۔

غیر مقلد کے شیخ الکل مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرماتے ہیں :

" اور معنی تقلید کے عرف میں یہ ہیں کہ وقت لاعلمی کے کسی اہل علم کا قول مان لینا اور اس پر عمل کرنا ، اور اسی معنی عرفی میں مجتہدوں کے اتباع کو تقلید بولا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور غزالی رح اور آمدی رح اور ابن الحاجبؒ نے کہا ہے کہ

---

[1] کشاف اصطلاحات الفنون ص۱۱۷۸ ۔ [4] تفسیر مظہری ص۳۲۴ جلد ۳ ۔

[2] شرح منار ص۲۵۲ بحوالہ الکلام المفید ص۳۲ ۔

[3] نامی شرح حسامی ص۱۹۰ ۔

رجوع کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع اور مفتی اور گواہوں کی طرف اگر تقلید قرار دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو اور مجتہدین کی اتباع کو تقلید کہنا مجوز ہے" [۱]

۲ : ابن ابوالعز رہ فرماتے ہیں :

فمن تعصب لواحد معین غیر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کمالک رہ و ابی حنیفۃ رہ والشافعی رہ واحمد و رای ان قول ھذا ھو الصواب الذی ینبغی اتباعہ دون قول الائمۃ الباقین فھو ضال وان اعتقد انہ یجب علی الناس اتباعہ دون غیرہ من ھولاء الائمۃ فانہ یخشی علیہ الکفر۔ [۲]

تو جس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی ایک متعین آدمی جیسے مالک رہ و ابوحنیفہ رہ شافعی اور احمد کے لئے تعصب اختیار کیا، اور اس نے یہ خیال کیا کہ یہی درست ہے اور بقیہ ائمہ کے علاوہ صرف انھیں کی اتباع مناسب ہے تو ایسا شخص گمراہ ہے اور اگر اس نے یہ اعتقاد رکھا کہ لوگوں پر اسی کی اتباع واجب ہی نہ اس کے علاوہ دوسرے ائمہ کی، تو ایسے آدمی کے ایمان کا خوف ہے۔

اگرچہ یہ عبارت تقلید کی مذمت کے سلسلے میں ہے اور اس کا جواب بھی انشاء اللہ آگے عرض کیا جائے گا۔ یہاں اس کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس غیر مقلد عالم نے اتباع کو تقلید ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

۳ : حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رہ فرماتے ہیں :

"اتباع اور تقلید کے معنی واحد ہیں" [۳]

نیز مولانا ارالاصاحب نے ابن القیم رہ کے حوالہ سے جو اتباع اور تقلید میں وجہ فرق بیان کی ہے، وہ وجہ فرق نہیں بلکہ دونوں کے درمیان اشتراک کی دلیل ہے فرماتے ہیں :

---

[۱] معیار الحق ص۳۵ ۔ [۳] سبیل الرشاد ص۲۰ ۔

[۲] تنبیہ الائمہ علی وجوب الاخذ بالکتاب والسنۃ ص۲۵-۲۶ ۔

"تقلید محض قول بلا معرفتِ دلیل کے قبول کرنے کا نام ہے" "اور اتباع علی وجہ البصیرت قبول کرنے کا نام ہے"۔

تقلید کی تعریف کی بحث میں یہ بات ثابت کی جا چکی ہے "بلامعرفۃ دلیل" کا مطلب یہ ہے' دلیل کا جاننا اور اس کا مطالبہ کرنا ضروری نہیں ہے کیوں کہ مقلد کو اس بات کا یقین ہے کہ مجتہد بلا دلیل کے بات نہیں کہتا۔ اس سلسلہ میں اسے اس قدر شرح صدر ہے کہ وہ مطالبہ دلیل کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔

چنانچہ تقلید کی تعریف میں "معتقدًا للحقیقۃ" کے الفاظ گذر چکے ہیں..... اور اتباع علی وجہ البصیرت کا بھی مفہوم یہی ہے۔ کیوں کہ اتباع علی وجہ البصیرت کا مفہوم اگر یہ مراد لیا جائے کہ وہ اس مسئلہ کی دلیل کو علی وجہ البصیرت جانتا ہے۔ تو پھر اسے کسی کی اتباع کی کیا ضرورت ہے؟ اتباع تو وہاں ہوتی ہے جہاں علم سے محرومی یا علم کی کمی ہو' علی وجہ البصیرت علم کے ہوتے ہوئے دوسرے کی اتباع کے کیا معنی؟

بہر حال یہ واضح ہے کہ تقلید کی تعریف میں "معتقدًا للحقیقۃ" کا لفظ اور "اتباع علی وجہ البصیرت" دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے اور اتباع اور تقلید باہم مترادف ہیں۔

اجماع کی اہمیت

کسی مسئلہ کے ثبوت اور وجوب کے دلائل شرعیہ میں اجماع بھی ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے:

" ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولہ ما تولی الخ (النساء)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وھذہ الاٰیۃ دلیل علی حرمۃ مخالفۃ الاجماع لانہ تعالیٰ رتب الوعید علی المشاقۃ واتباع غیر	اور یہ آیت مخالفت اجماع کے حرام ہونے کی دلیل ہے اس لئے کہ اللہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور مسلمانوں کے طریقہ

سبیل المومنین ولاوجه لکون احدهما سببًا له دون الأخر والا لغا ذکر الاخر ولایکون مجموعهما سببًا لان المشاقة محرمة بانفرادها بالنصوص القطعیة فظهران کل واحد منهما سبب للوعید فثبت ان اتباع غیر سبیلهم محرم فثبت ان اتباع سبیلهم واجب لان الانسان لامحالة سالك سبیلاً روى البیهقی والترمذی عن ابن عمرؓ وابن عباس قالا قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایجمع الله هٰذه الامة علی الضلالة ابدًا وید الله علی الجماعة ومن شذ شذ فی النار[1]

کے علاوہ کی اتباع کو وعید کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک ہی چیز کو سبب قرار دیا جائے کیوں کہ اس صورت میں دوسرے کا ذکر لغو ہو جائے گا۔ نیز دونوں چیزوں کے مجموعے کو بھی سبب قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ مخالفت رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو نصوص کی بنا پر مستقلاً حرام ہے تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ دونوں میں سے ہر ایک سبب وعید ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مسلمانوں کے طریقہ کے علاوہ کی اتباع کرنا حرام اور مسلمانوں کے طریقہ کی اتباع واجب ہے۔ کیوں کہ انسان کوئی نہ کوئی راستہ تو ضرور اختیار کرے گا۔ بیہقی اور ترمذی نے ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کو اللہ تعالیٰ گمراہی پر کبھی بھی جمع نہ فرمائیں گے۔ اور اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے اور جس نے الگ راستہ اختیار کیا وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا

علامہ قرطبی رہ فرماتے ہیں:

قال العلماء فی قوله تعالیٰ "ومن یشاقق الرسول" دلیل علی صحة القول بالاجماع[2]

علماء نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "ومن یشاقق الرسول" میں اجماع کی صحت پر دلیل ہے

---

[1] تفسیر مظہری ص۲۳۰ جلد ۳

[2] تفسیر القرطبی جلد ۵ ص۳۸۶۔

تقلید کا وجوب اجماع سے

تقلید پر امت کا اجماع ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فالتمذهب للمجتهدين سرّ الهمهٗ الله تعالى للعلماء وجمعهم من حيث يشعرون اولا يشعرون [1]

مجتہدین کرام کا مسلک اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جیسے اللہ نے علماء کے دلوں میں ڈال دیا ہے اور ان کو اس پر جمع کر دیا چاہے وہ اس راز کا ادراک کریں یا نہ کریں۔

نیز شاہ صاحب اپنے رسالہ "الانصاف" میں تقلید پر اجماع نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

كان هذا هو الواجب فى ذالك الزمان [2]

اور اس وقت میں تقلید واجب ہو گئی۔

طحطاویؒ فی شرح درالمختار فی کتاب الذبح قال بعض المفسرين هذه الطائفة الناجية المسماة باهل السنة والجماعة اجمعت اليوم فى المذاهب الاربعة [3]

طحطاوی نے درمختار کی شرح میں کتاب الذبح کے اندر لکھا ہے کہ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ اس فرقہ ناجیہ یعنی اہل سنت والجماعت نے اس زمانہ میں مذاہب اربعہ میں انحصار پر اجماع کر لیا ہے۔

صاحب الروض الباسم ایک معترض کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

وهذا كله يودى الى تمكين العامى عن عدم وجوب الرجوع الى العلماء لكن المعلوم وجوب ذالك على العوام من اجماع الصحابة نـ فبطل ما ادى الى

اور (تمہاری) یہ سب بات یہاں تک پہنچاتی ہے کہ عامی کے لیے علماء کی طرف عدم وجوب رجوع کی بھی وسعت ہے۔ لیکن صحابہ کرامؓ کے اجماع سے یہ معلوم ہے کہ عامی پر علماء کی طرف رجوع کرنا واجب

---

[1] الانصاف فی بیان سبب الاختلاف [2] الانصاف صـ۵۲ [3] مدارالحق صـ۳۴۱۔

مخالفۃ لجماعہم ....

ہے اور جو چیز صحابہ کرام رض کے اجماع کے خلاف ہو تو وہ خود باطل ہے ....

واما اجماع الصحابۃ علی تقریر العوام علی التقلید فلانہ اجماع فعلی لا لفظی [1]

اور حضرات صحابہ رض کے اجماع فعلی سے نہ کہ لفظی (اور نصی) سے یہ ثابت ہے کہ عوام کو تقلید پر برقرار رکھا جائے .

ان تصریحات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچی کہ کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ تقلید کا ثبوت و وجوب اجماع امت سے بھی ہے .

تقلید کا وجوب قیاس سے

دلائل شرعیہ میں قیاس بھی ہے .... صاحب المنار فرماتے ہیں ؛

وانہ حجۃ نقلا وعقلا ' اما النقل فقولہ تعالی فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ وحدیث معاذ معروف [2]

اور بے شک قیاس حجت ہے نقلی طور پر بھی اور عقلاً بھی بہر حال نقل ' تو اللہ تعالے کا قول "عبرت حاصل کرو اے عقلمندو ' اور حضرت معاذ رض کی حدیث جو معروف ہے .

تقلید کا وجوب قیاس سے بھی ثابت ہوتا ہے ۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح نے الانصاف میں اور علامہ ابن حجر مکی رح نے فتح المبین شرح اربعین للنووی میں یہ اصول بیان کیا ہے ؛

مقدمۃ الواجب ' واجب [3]

واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے .

اور علامہ طیبی رح نے شرح مشکوۃ میں شیخ ابو محمد عبد العزیز بن سلام رح کی کتاب "القواعد" کے حوالے سے تحریر فرمایا ہے کہ ؛

البدعۃ منقسمۃ الی واجب کالاشتغال بعلم النحو الذی یفهم بہ کلام اللہ و کلام

بدعت منقسم ہوتی ہے ' واجب کی طرف جیسے علم نحو میں مشغول ہونا . جس کے ذریعہ اللہ اور رسول ص کے

---

[1] الروض الباسم ص ۱۰۹ ج ۱ ، [2] المنار مع نور الانوار ص ۲۲۲ ، [3] مدار الحق ص ۳۵۸ ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و حفظ اعراب الکتاب والسنۃ وتدوین اصول الفقہ والکلام فی الجرح والتعدیل وتمییز الصحیح من السقیم والرد علی الجبریہ والقدریہ والمرجیہ والمجسمہ لان حفظ الشریعۃ واجب وذا لایتأتی الابذلک وما لایتم الواجب الا بہ فھو واجب بہ[1]

کلام کو سمجھا جاتا ہے۔ اور کتاب وسنت کے اعراب کا یاد کرنا، اور اصول فقہ کی تدوین کرنا، جرح وتعدیل، صحیح اور سقیم کی تمیز کے سلسلہ میں گفتگو کرنا جبریہ، قدریہ، مرجیہ اور مجسمہ کی تردید کرنا اس لئے کہ شریعت کی حفاظت واجب ہے اور یہ ان چیزوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اور جس چیز کے بغیر واجب حاصل نہیں ہوسکتا وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔

انہیں دونوں اصولوں کے پیش نظر صاحب مدار الحق فرماتے ہیں کہ:

فکذالک تقلید المذاھب.. کان واجبًا لانہ مقدمۃ الواجب لان حفظ الشریعۃ واجب وذالک لایحصل فی ذالک الزمان لشیوع الخیانۃ وفساد النیۃ فی ذالک الزمان الابہ[2]

اسی طرح تقلید مذاہب بھی واجب ہے کیوں کہ وہ واجب کا مقدمہ ہے۔ اس لئے کہ شریعت کی حفاظت واجب ہے اور یہ اس زمانہ میں تقلید کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس زمانے میں خیانت اور فساد نیت کے عام ہوجانے کی وجہ سے۔

حسب تحقیق علامہ ابن الہمام رح صاحب فتح القدیر و شیخ محمد حضری بک رح صاحب تاریخ التشریع الاسلامی

"ایک لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مجتہدین حضرات کی تعداد بیس سے متجاوز نہ تھی"[3] بقیہ صحابہ کرام رض حسب ضرورت انہیں حضرات کی تقلید کرتے تھے۔

ان حضرات میں یہ رائج تقلید معین اور غیر معین دونوں نوعیتوں کی تھیں۔

آئندہ سطور میں ان دونوں عنوانوں کے تحت دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ مدار الحق صفحہ ۳۹ [3] ملاحظہ ہو فتح القدیر ص ۳۳ و تاریخ التشریع الاسلامی صفحہ ۱۰۱

[2] مدار الحق صفحہ ۳۹۔

عہد صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ میں تقلید غیر معین

(۱) عن ابن عباس رضؓ قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابیۃ وقال ایھا الناس من اراد ان یسأل عن القرآن فلیات ابی ابن کعب رضؓ ومن اراد ان یسأل عن الفرائض فلیات زید بن ثابت ومن اراد ان یسأل عن الفقه فلیات معاذ بن جبل ومن اراد ان یسأل عن المال فلیاتنی فان اللّٰه جعلنی له والیا وقاسما۔
(رواہ الطبرانی فی الاوسط)[۱]

حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو وہ ابی ابن کعب رضؓ کے پاس جائے جو میراث کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہو وہ زید بن ثابت کے پاس جائے، اور جو شخص فقہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہو وہ معاذ بن جبل سے معلوم کرے۔ اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہے وہ میرے پاس آئے اللہ نے مجھے اس کا والی اور قاسم بنایا ہے۔

اس خطبہ میں حضرت عمر رضؓ نے دین کے مختلف نوع کے مسائل کو مختلف لوگوں سے پوچھنے کی تلقین فرمائی۔ یہ پوچھنا دو نوعیت کا ہو سکتا ہے۔

۱۔ مسائل کی تحقیق کرنا، ان کے دلائل معلوم کرنا۔ ظاہر ہے کہ سارے لوگوں میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

۲۔ محض عمل کے لئے مسائل معلوم کرنا، اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

(۲) حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان قال حدثنا عمرو ابن دینار قال سألنا ابن عمر عن رجل اعتمر فطاف بالبیت سبعا ولم یطف بین الصفا والمروۃ ایقع دامرأته فقال ابن عمر قدم رسول اللّٰه

ہم نے ابن عمر رضؓ سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا جس نے عمرہ کیا اور خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان طواف نہیں کیا۔ کیا وہ اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے، تو ابن عمرؓ نے فرمایا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور

---

[۱] بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت ص ۳۳

صلی اللہ علیہ وسلم فطاف بالبیت سبعا وصلی خلف المقام رکعتین وطاف بین الصفا والمروۃ وقال واللہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ قال عمرو وسالنا جابر بن عبد اللہ فقال لا یقربہا حتی یطوف بین الصفا والمروۃ [1]

خانہ کعبہ کا سات دفعہ طواف فرمایا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور صفا اور مروہ کے درمیان طواف فرمایا۔ ابن عمر نے فرمایا۔ اللہ کی قسم تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاۃ میں بہترین نمونہ ہے۔ عمروؓ فرماتے ہیں۔ جابر بن عبداللہ رضؓ سے سوال کیا، تو انہوں نے فرمایا بیوی کے پاس نہیں جائے جب تک کہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف نہ کرلے۔

ثابت ہوا کہ ایک مسئلہ عمرو بن دینار نے عبداللہ بن عمرؓ سے معلوم کیا۔ پھر اسی مسئلہ کو جابر بن عبداللہ سے بھی معلوم کیا، دلیل کسی سے دریافت نہیں کی۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت ابن عمر نے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے دلیل پیش کردی اور حضرت جابر رضؓ نے بلا دلیل پیش کئے مسئلہ بتلا دیا

(۳) عن سالم بن عبد اللہ قال کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام قال سألت القاسم بن محمد عن ذلک فقال ان ترکت فقد ترکہ ناس یقتدی بہم وان قرأت فقد قرأہ ناس یقتدی بہم وکان القاسم ممن لا یقرأ [2]

سالم ابن عبداللہ کہتے ہیں، ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے تو میں نے حضرت قاسم بن محمد رضؓ سے اس بارے میں سوال کیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا اگر تم اس کو ترک کردو تو ایسے لوگوں نے اسے ترک کردیا ہے جن کی اقتدا کی جاتی تھی اور اگر قرأت کرو تو بہت سے لائق اقتداء لوگوں نے ایسا بھی کیا ہے اور خود قاسم قرأت خلف الامام نہ کرنے والوں میں تھے۔

مسئلہ مذکورہ میں صحابہ کرام رضؓ کے دو گروہ تھے۔ حضرت محمد بن قاسم رحؒ ان میں سے کسی کی بھی تقلید کو غیر مستحسن قرار نہیں دیتے۔

(۴) عن میمون بن مہران ان ابن عمرؓ

میمون بن مہران سے مروی ہے کہ ابن عمرؓ سے

---

[1] مسند حمیدی ص ۲۹۴ ج ۲۔

[2] موطا امام محمد ص ۹۶ باب القرأۃ خلف الامام۔

سئل عن رجل له امتان وهما اختان فوطی احداهما واراد ان یطأ الاخری فقال لیس ذالك له قیل فان قربها قال لاتخرج التی وطی من ملکه [۱]

اس آدمی کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کے پاس دو بہنیں بطور باندی تھیں۔ ایک سے اس نے وطی کیا پھر دوسری سے بھی وطی کا ارادہ کیا تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے پھر کہا گیا اگر اس نے وطی کر لی تو؟ فرمایا جس سے اس نے وطی کی ہے وہ اس کی ملکیت سے نہیں نکلے گی۔

روایت مذکورہ میں حضرت ابن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا گیا اور کوئی دلیل طلب نہیں کی گئی اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

(۵) عن سلیمان بن یسار ان ابا ایوب الانصاری خرج حاجاً حتی اذا کان بالنازیة من طریق مکة اضل رواحله وانه قدم علی عمر بن الخطابؓ یوم النحر فذکر ذالك له فقال عمر بن الخطاب اصنع ما یصنع المعتمر ثم قد حللت فاذا ادرکك الحج قابلا فاحجج واهد ما استیسر من الهدی [۲]

حضرت سلیمان بن یسارؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ حج کے ارادے سے نکلے۔ جب مکہ کے راستہ میں مقام نازیہ تک پہنچے تو ان کی سواریاں گم ہوگئیں اور وہ یوم النحر میں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور ان سے یہ واقعہ ذکر کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ ارکان ادا کر لو جو عمرہ والا ادا کرتا ہے۔ اور احرام کھول دو۔ پھر اگلے سال جب حج کا زمانہ آئے تو دوبارہ حج کرو اور جو قربانی میسر ہو ذبح کرو۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے مسئلہ کی دلیل نہیں دریافت کی اور نہ حضرت عمرؓ نے بتائی۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے فہم واجتہاد پر اعتماد کر کے عمل فرمایا۔ اسی کو تقلید کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ مذکورہ دلائل تقلید مطلق کے سلسلہ میں تھے۔ آگے تقلید معین کے سلسلہ میں دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

عہد صحابہؓ اور تابعین میں تقلید معین

(۱) عن عکرمة ان اهل المدینة سألوا

اہل مدینہ نے حضرت ابن عباسؓ سے اس عورت

---

[۱] سنن سعید ابن منصور القسم الاول من المجلد الثالث ص ۴۰۱۔

[۲] موطا امام مالکؒ ص ۱۳۹۔

بن عباس عن امرأة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا ناخذ بقولك و ندع قول زيد[1]

کے بارے میں سوال کیا جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہوگئی۔ ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہ وہ جا سکتی ہے۔ اہل مدینہ نے کہا ہم آپ کے قول پر زید بن ثابت کے قول کو چھوڑ کر عمل نہیں کریں گے۔

اس روایت سے صراحت کے ساتھ تقلید معین کا ثبوت ہوتا ہے۔ اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس سے دوٹوک لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ ہم زید بن ثابت کے قول کو چھوڑ کر آپ کے قول پر عمل نہیں کر سکتے... یہی تقلید معین ہے۔

(۲) سئل ابو موسیٰ عن ابنه وابنة ابن واخت فقال للابنة النصف وللاخت النصف وائت ابن مسعود فسيتابعنی فسئل ابن مسعود واخبر بقول ابی موسیٰ فقال لقد ضللت اذن وما انا من المهتدين اقضی فيها بما قضی النبی صلی الله عليه وسلم للابنة النصف ولابنة الابن السدس تكملة الثلثين وما بقی فللاخت فاتينا ابا موسیٰ فاخبرنا بقول ابن مسعود فقال لا تسئلونی مادام هذا الحبر فيكم[2]

حضرت ابو موسیٰ رضؓ سے ایک لڑکی، پوتی اور بہن کی میراث کے سلسلہ میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، بیٹی کو آدھا اور بقیہ آدھا بہن کو ملے گا۔ پھر انہوں نے کہا، ابن مسعود کے پاس جاؤ وہ میرے مثل فتویٰ دیں گے۔ تو ابن مسعود رضؓ سے سوال کیا گیا اور انہیں ابو موسیٰ کے قول کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے فرمایا، اس وقت تو میں بھٹک جاتا اور راہ راست پر نہ رہتا۔ میں تو اس سلسلہ میں وہ فیصلہ کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ بیٹی کو نصف ملے گا پوتی کو سدس ملے گا ثلثین کی تکمیل کرتے ہوئے اور بقیہ بہن کو ملے گا۔ راوی کہتے ہیں، پھر ہم ابو موسیٰ کے پاس آئے اور انھیں ابن مسعود رضؓ کے قول کی اطلاع دی اس پر انہوں نے کہا جب تک یہ محقق عالم موجود ہیں مجھ سے مسائل نہ معلوم کیا کرو۔

---

[1] صحیح البخاری جلد ۱ صفحہ ۲۳۷۔

[2] بخاری شریف صفحہ ۹۹۷ ج ۲۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رض جیسے صحابی فرما رہے ہیں کہ جب تک عبداللہ ابن مسعود رض ہمارے درمیان موجود ہیں تمام مسائل انہیں سے دریافت کئے جائیں۔ مجھ سے نہ معلوم کئے جائیں۔ اسی کا نام تقلید معین اور تقلید شخصی ہے۔

۱۳۔ عن معاذ بن جبل ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لما بعثه الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض لك قضاء؟ قال اقضی بکتاب اللّٰه قال فان لم تجد فی کتاب اللّٰه؟ قال فبسنة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال فان لم تجد فی سنة رسول اللّٰه ولا فی کتاب اللّٰه؟ اجتهد رایی ولا آلو فضرب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم صدره فقال الحمد للّٰه الذی وفق رسول رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لما یرضی رسول اللّٰه ؎

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن بھیجا تو فرمایا کہ جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کس طرح فیصلہ کروگے۔ عرض کیا، کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ فرمایا اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ و سنت دونوں میں نہ ملے تو؟ عرض کیا اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد اور استنباط کروں گا۔ اور (حق تک پہنچنے کی کوشش میں) کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رض کے سینے پر اپنا دستِ مبارک مارا، اور فرمایا، اللہ کا شکر ہے اس نے اللہ کے رسول کے اس قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

حضرت معاذ کا یہ واقعہ مسئلہ اجتہاد اور تقلید کے سلسلہ میں ایک آئین کلی اور شمع ہدایت کا درجہ رکھتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نہ صرف یہ کہ اجتہاد اور قیاس کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ اس پر حد درجہ مسرت کا اظہار فرمایا ... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا حاکم، قاضی، معلم اور مجتہد بنا کر روانہ فرمایا تھا۔ یمن کے جس حصہ میں وہ تھے تنہا ہی تھے جس سے

؎ ابوداؤد شریف ص۱۴۹ مشکوٰۃ شریف ص۳۲۴،

صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے لئے ان کی اتباع لازم قرار دی یہی تقلید معین ہے۔

روایت سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ اہل یمن حضرت معاذ رض کی تقلید کیا کرتے تھے۔

بخاری شریف میں ہے :

عن الاسود بن یزید قال اتانا معاذ بن جبل بالیمن معلما امیرا فسألناه عن رجل توفی وترک ابنته و اخته فاعطی الابنة النصف والاخت النصف وفی روایۃ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیٌّ۔[1]

حضرت اسود بن یزید کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رض ہمارے یہاں تعلیم کنندۂ احکام دین اور حاکم بن کر آئے، ہم نے ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا کہ ایک شخص مرگیا اور اس نے ایک بیٹی اور ایک بہن چھوڑی۔ حضرت معاذ رض نے نصف کا بیٹی کے لئے اور نصف کا بہن کیلئے حکم فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ اس وقت زندہ تھے۔

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رہ تحریر فرماتے ہیں :

"اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں تقلید جاری تھی۔ کیوں کہ تقلید کہتے ہیں، کسی کا قول محض اس حسن ظن پر مان لیا جائے کہ یہ دلیل کے مطابق بتلاوے گا۔ اور اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا، سو قصۂ مذکورہ میں سائل نے تو دلیل دریافت نہیں کی اور محض اس کے تدین کے اعتماد پر قبول کرلیا اور یہی تقلید ہے۔ اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے تھے۔ پھر اس جواب کے اتباع پر جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تھا، نہ حضور ص سے انکار ثابت ہے اور نہ کسی اور سے رد منقول ہے۔ اس سے جواز تقلید حضور کی حیات میں اس کا بلانکیر شائع ہونا ثابت ہوگیا"[2]

۴:- عن عمرو بن میمون الاودی قال

حضرت عمر بن میمون الاودی رہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] بخاری شریف ص ۹۹۷ ج ۲۔

[2] الاقتصاد ص ۷

قدم علینا معاذ بن جبل الیمن رسول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الینا فسمعت تکبیرہ مع الفجر رجل اجش الصوت قال فالقیت محبتی علیہ فما فارقتہ حتی دفنتہ بالشام میتاً ثم نظرت الی افقہ الناس بعدہ فاتیت ابن مسعود فلزمتہ حتی مات [1]

حضرت معاذ بن جبل ہمارے پاس یمن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سفیر بن کر آئے فرماتے ہیں، میں نے نماز فجر میں ان کی تکبیر سنی وہ بھاری آواز والے تھے۔ میرے دل میں قدرت کی طرف سے ان کی محبت ڈال دی گئی۔ اس کے بعد ان سے اس وقت تک جدا نہیں ہوا جب تک ان کا انتقال نہ ہوگیا۔ اور انہیں میں نے شام میں دفن نہیں کردیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان کے بعد سب سے بڑا فقیہ کون ہے تو میں حضرت ابن مسعود کے پاس آیا اور انہی کے ساتھ رہنے لگا یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔

اس روایت میں حضرت عمر بن میمون رض کا یہ فرمانا کہ جب تک حضرت معاذ بن جبل زندہ رہے میں انھیں کی صحبت میں رہا اور انھیں سے رجوع کرتا رہا۔ ان کے بعد ابن مسعود رض لوگوں میں افقہ نظر آئے اور پھر انھیں سے منسلک رہا۔ یہ تقلید معین کی واضح نظیر ہے۔

۵۔ قال الشعبی من سرہ ان یاخذ بالوثیقۃ فی القضاء فلیأخذ بقول عمر وقال مجاھد اذا اختلف الناس فی شیٔ فانظروا ما صنع عمر فخذوا بہ ...... قال محمد بن جریر لم یکن احد لہ اصحاب معروفون حرروا فتیاہ ومذاھبہ فی الفقہ غیر ابن مسعود کان یترک مذھبہ وقولہ

شعبی رہ فرماتے ہیں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ قضا میں مکمل یقین حاصل کرے تو وہ شخص حضرت عمر رض کے قول کو اختیار کرے۔ مجاہد رہ فرماتے ہیں جب لوگ کسی چیز میں اختلاف کریں تو حضرت عمر رض کے قول وعمل کو دیکھو اور اسی کو اختیار کرو۔ محمد بن جریر رہ کہتے ہیں، ابن مسعود رض کے علاوہ کسی کے ایسے معروف اصحاب نہیں تھے جنھوں نے فقہ میں اس کے فتاوے اور مذاہب

---

[1] ابوداؤد شریف ص ۶۲ ج ۱

لقول عمر ------ وقال الشعبی کان عبد اللہ لا یقنت ولو قنت عمر لقنت عبد اللہ [1]

کو تحریر کیا ہو۔ اس کے باوجود ابن مسعود رض اپنے مسلک اور قول کو حضرت عمر رض کے قول کے مقابلہ میں ترک کر دیتے تھے ------ شعبیؒ فرماتے ہیں، عبد اللہ قنوت نہیں پڑھتے تھے۔ اگر عمر قنوت پڑھتے تو وہ بھی ضرور پڑھتے۔

حضرت شعبی رح اور مجاہد رح نے واضح الفاظ میں حضرت عمر رض کی تقلید کی تلقین کی اسی طرح ابن عمر رض ابن مسعود رض جیسے اساطین علم وفضل اپنے عمل کی بنیاد حضرت عمر رض کے عمل اور فیصلہ پر رکھتے تھے، اسے بجز تقلید اور کیا کہا جائے گا

۶۔ قال طاؤس ادرکت سبعین من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا تدارؤا فی شیء انتہوا الی قول ابن عباس [2]

طاؤس کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ستر صحابہ سے ملاقات کی ہے وہ حضرات جب کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے تو ابن عباس کے قول کی طرف رجوع کرتے تھے۔

یہ ستر کی تعداد میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس رض کے قول کو مرجع قرار دیتے تھے، بلفظ دیگر یہ سب حضرت انہیں کی تقلید کرتے تھے۔

۷۔ کان عمر رضی اللہ عنہ یفعل ذالک فان اعیاہ ان یجد فی القرآن والسنۃ نظر ھل کان لابی بکر فیہ قضاء؟ فان وجد ابا بکر رض قضی فیہ بقضاء قضی بہ والا دعا رؤس المسلمین فاذا اجتمعوا علی امر قضی بہ [3]

حضرت عمر رض (کتاب وسنت سے مسائل اخذ کرتے تھے) اگر وہ کتاب وسنت سے مسئلہ مستنبط کرنے سے قاصر رہتے تھے تو دیکھتے تھے کہ حضرت ابو بکر رض کا اس مسئلہ میں کوئی فیصلہ ہے؟ اگر حضرت ابو بکر رض کا فیصلہ معلوم ہو جاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے ورنہ اہم مسلمانوں کو جمع کرتے اگر وہ لوگ کسی رائے پر مجتمع ہو جاتے تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔

---

[1] مقدمہ اعلاء السنن جلد ۲ ص۶۳ [2] مقدمہ اعلاء السنن جلد ۲ ص۔ [3] تاریخ الخلفاء ص۴۲

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کتاب وسنت میں مسئلہ نہ پانے کی شکل میں حضرت ابو بکر رض ہی کے قول کی طرف رجوع کرتے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے ان کے فیصلہ کے موجود ہونے کی شکل میں کسی دوسرے کے فیصلہ کو قابل تسلیم نہیں قرار دیتے تھے۔ تقلید معین اسی کو کہتے ہیں۔

۸:۔ کتب اهل الکوفه الی ابن الزبیر فی الجد فقال اما الذی قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم "لو کنت متخذا من هٰذه الامة خلیلا لاتخذته" انزله ابا یعنی ابا بکر[۳]

اہل کوفہ نے ابن زبیر سے "جد" کے سلسلہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا، وہ آدمی جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں اس امت میں اگر کسی کو اپنا خلیل بناتا تو انھیں کو بناتا" انہوں نے "جد" کو "اب" کے درجہ میں رکھا ہے۔ ابن زبیر کی مراد (اس آدمی سے) حضرت ابو بکر رض تھے۔

حضرت ابن زبیر کے پیرایۂ کلام سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت ابو بکر رض کا قول دیگر تمام حضرات کے اقوال کی بنسبت افضل اور اقرب الی الصواب ہے۔ پھر انھوں نے مسئلہ مذکورہ میں حضرت ابو بکر کے فیصلہ کی دلیل بھی نہیں بیان کی۔ دلیل نہ بیان کرنا تقلید ہے اور حضرت ابو بکر رض کی فضیلت بیان کرنا انھیں کے قول کو اختیار کرنے کی تلقین ہے۔ یہی مفہوم ہے تقلید معین کا۔

آئندہ محاضرے میں "تقلید شخصی کی ضرورت" پر انشاء اللہ مفصل گفتگو کی جائے گی

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰه رب العٰلمین

۳؎ بخاری شریف جلد ۱ ص ۵۱۶۔

بابت ۱۴۱۵ھ

تیسرا محاضرۂ علمیہ

بر موضوع

ردّ غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

تقلیدِ شخصی ہی کا وجوب کیوں ؟

الحمد للہ وکفی وعلیٰ عبادہ الذین اصطفی

گذشتہ مباحث سے یہ بات منقح ہو چکی کہ تقلید کی دونوں نوعوں یعنی معین اور غیر معین کا وجوب کتاب **وسنت، قیاس** اور اجماع امت اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل سے بڑی صراحت **اور وضاحت** کے ساتھ ثابت ہے۔ اس طرح سے اصطلاح فقہاء کے مطابق تقلید اپنی اصل کے اعتبار سے واجب مخیر ہوئی۔

واجب مخیر کی حقیقت یہ ہے کہ وجوب کا تعلق دو یا چند متعین امور میں سے کسی فرد مبہم کے ساتھ ہو کہ آدمی ان امور میں سے جس فرد کو ادائیگی کے لئے متعین کر لے اسے اختیار ہے اور اس فرد کو ادا کر لینے سے واجب ادا ہو جائے گا ۔۔۔۔۔۔۔۔ تو گویا کہ ان امور میں سے کسی ایک کا ادا کرنا تو واجب ہے۔ لیکن اس ایک کی تعیین کے سلسلہ میں آدمی مختار ہے شلاً کفارۂ یمین کہ نفس کفارہ تو فرض ہے لیکن ادا کرنے والے کو اس کا اختیار ہے کہ کھانا کھلائے، یا مسکینوں کو کپڑا دے، یا غلام آزاد کرے۔

صاحب مسلم الثبوت فرماتے ہیں :

ایجاب امر من امور معلومة صحیح	امور معلومہ میں سے کسی ایک کو واجب کرنا صحیح
وھو الواجب المخیر کخصال	ہے اور اس کو واجب مخیر کہتے ہیں جیسے کفارہ کے

الکفارۃ [۱] افراد۔

شیخ محمد حضری بک رحمہ اللہ واجب مخیر کی تشریح و تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

منقسم الی معین و مخیر فالمعین ما طلبہ الشارع عینا والمخیر ما طلبہ الشارع مبھمًا فی واحدٍ من امور معینۃ کاحد خصال الکفارۃ قد یعین الشارع مطلوبہ فیسمی ھذا الواجب معینًا وقد یبھمہ فی واحدٍ من امور معینۃ نحو قولہ تعالیٰ فی کفارۃ الیمین "فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم اوکسوتھم اوتحریر رقبۃ" ویسمی ھذا واجبًا مخیرًا فالتکلیف یتعلق بواحد مبھم من ھذہ الامور الثلاثۃ المعینۃ والواحد المبھم قدر مشترک بین الخصال کلھا لصدقہ علی کل واحد منھا وحینئذٍ لاتعدد فیہ [۲]

واجب معین اور مخیر کی طرف منقسم ہوتا ہے۔ معین وہ جس کو شارع نے بعینہٖ طلب کیا ہو، اور مخیر وہ ہے جس کو شارع نے لاعلی التعیین امور معلومہ سے کسی ایک کے اندر طلب کیا ہو۔ جیسے کفارہ کے افراد میں سے کوئی ایک کبھی شارع اپنے مطلوب کو متعین کر دیتے ہیں تو اس واجب کو معین کہا جاتا ہے اور کبھی امور معلومہ میں سے کسی ایک کے اندر مبہم رکھتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول کفارہ یمین میں فکفارتہ الخ " تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ اس اوسط کھانے میں سے جس کو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا ہے یا غلام آزاد کرنا ہے"
اس واجب کو واجب مخیر کہتے ہیں۔ تو تکلیف کا تعلق ان تینوں امور میں سے کسی واحد مبہم سے ہے اور واحد مبہم ان تمام افراد کے درمیان قدرِ مشترک ہے اس کے ہر ہر فرد پر صادق آنے کی وجہ سے تو اس وقت وجوب میں تعدد نہیں ہوگا۔

"واجب مخیر" اور نفس تقلید کے واجب مخیر ہونے کی محققانہ تشریح کرتے ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک سائل (جس کا یہ خیال تھا کہ تقلید شخصی مباح ہے اور اس کو واجب کہنا بدعت سیئہ ہے)

---

[۱] مسلم الثبوت ص ۲۹۔ [۲] اصول الفقہ للحضری بک ص ۴۶۔

کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں :

" پس تقلید مطلق تو فرض ہے یقین ہے کہ آپ بھی قبول کرلیں گے، ورنہ اثبات اس کا کردیا جائے گا اور اس کے دو فرد ہوویں گے۔ تقلید شخصی اور غیر شخصی کیوں کہ دونوں حصے ایک جنس کے ہیں خواہ اسکو جنس کی دونوع کہو یا مطلق اور دو فرد مقید کہو، خواہ کلی اور دو جزوی کہو جس طرح چاہو مقرر کرو۔ بہر حال دو نوع تقلید مطلق کے ہوویں گے جو فرض ہے۔

بھلا آپ سے پوچھتا ہوں کہ فرض کے نوع یا فرد مباح کس طرح ہوئے مرد خدا فرض اور مباح تو مبائن دو نوع ہیں کہ تحت جنس حکم کے ہیں پھر ایک نوع مبائن دوسری نوع کی فرد کس طرح ہوگی۔ ذرا سوچو کہ تقلید مطلق تو فرض اور شخصی مباح اور حالانکہ یہ فرد ہے تقلید فرض کی۔ پس تمام آپ کا خدشہ اس ہی خطاء فہم پر مبنی ہے۔ پس ہوش کرو کہ تقلید بہر دو نوع فرض ہے کوئی مباح نہیں، مگر چونکہ امتثال امر تقلید میں تخییر ہے کہ جس فرد کو چاہو ادا کردو، دوسرے کی ضرورت نہیں اور جو دونوں ترک کروگے تو عاصی ہوگے اس تخییر کو مباح کہہ دیا ہے مجازاً نہ یہ کہ خود شخصی مباح ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کفارہ میں حلف کے مثلاً نفس کفارہ فرض ہے اور اطعام اور کسوہ اور رقبہ میں تخییر جس کو ادا کردیا مطلق کفارہ سے براءت ہوگئی اور جو کسی کو نہ کیا، عاصی رہا علی ھذا مطلق اضحیہ واجب اور بکرا، اور سبع بقر و ابل اور پھر نر، یا مادہ وغیرہا جزئیات میں خیار جس فرد کا آتی ہوا، آتی فرض ہی کا ہوا، مباح کوئی بھی نہیں، سب فرض ہیں مگر ایک کے اتیان سے سب سے بری ہوجاتا ہے۔ یہی حال جملہ کلیات کا ہے کہ مطلق شرعی فرض ہوتا ہے اور مباح کہنا ان کا باعتبار اختیار کسی فرد کے ہے نہ کہ مباح مقابل فرض کے کہ آپ نے شبہ فرض ہوجانے، مباح کا بے موقع کیا، ورنہ اگر یہی شبہ ہے تو شخصی والے اسی آپ کی تقریر سے غیر شخصی کو بدعت سیئہ کہہ دیویں گے کیوں کہ غیر شخصی کس طرح فرض ہوتی ہے وہ بھی تو مباح بہیں معنی ہے جو مذکور ہوا۔۔۔ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہاں کہا ہے کہ غیر شخصی کے وجوب پر اجماع منعقد ہوا

ہے تاکہ مقابل نوع اس کے حرام ہو. کیوں کہ وجوب کا مقابلہ حرمت سے ہوتا ہے، اگر فرضاً یہ کہا ہے تو شخصی مباح کس طرح ہوگئی بلکہ حرام ہوئی اور یہی کوتاہ فہمی غیر مقلدین جہاں کو ہوئی بلکہ (شاہ صاحب نے) یہ فرمایا ہے کہ قرون ثلثہ میں باجماع جائز رہی ہے.

پس جواز سے دوسری نوع مقابل کی کراہت کس طرح ثابت ہوگئی، امکانِ خاص تو پڑھا ہی ہوگا اور شرع میں ایک فرد کلی کے جواز سے دوسرے فرد کی کراہت کہاں ثابت ہے. جواز اضحیہ شاۃ سے جو صحابہ میں شائع رہا. سبع بقر حرام کیوں کر ہوا بلکہ کلی کے حکم سے سب افراد جائز ہیں اور تعامل فرد واحد سے دیگر افراد مرتفع نہیں ہوتے. مساوی الاقدام رہتے ہیں. پس اگر یہ قاعدہ ذہن نشین ہوگیا ہے تو سوچو کہ جیسے آپ کے نزدیک شخصی مباح ہے ایسے ہی غیر شخصی بھی مباح ہے اور جیسا کہ غیر شخصی مرادف اس کی ہے آپ کے نزدیک واجب ہے ویسے ہی معین کہ شخصی اس کی مرادف ہے واجب ہی ہے اور حق یہی ہے کہ دونوں واجب ہیں اور اباحت دونوں میں بمعنی تخییر ارتکاب احدہما ہے اور بس... اپنی ذات میں دونوں فرض ہیں تو آپ کا شبہ تو گاؤ خرد ہوا" [1]

الحاصل تقلید اپنے دونوں افراد کے اعتبار سے واجب مخیر ہوئی --- واجب مخیر کے افراد میں سے جس کو بھی ادا کر دیا جائے. آدمی وجوب سے بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن افراد ادا کرنے سے پہلے تخییر اور تعیین کے اعتبار سے مباح رہتے ہیں.

مفتی برکت اللہ صاحب فرنگی محلی رح فرماتے ہیں:

"الوجوب التخييري انما يكون بين الجائزات" [2]

مطلب یہ ہے کہ وہ افراد ایک ایک کر کے مباح ہیں اور ان کے درمیان واحد مبہم اور قدر مشترک

---

[1] مکتوب حضرت گنگوہی رح تالیفات رشیدیہ ص ۵۲۸ - ۵۲۹.

[2] التعليق المنعوت على مسلم الثبوت ص ۲۹

واجب ہے۔ مباح بلکہ مندوب کے سلسلہ میں یہ ضابطہ ہے کہ اگر اس کے کرنے کی وجہ سے کسی فتنہ کا خدشہ اور اندیشہ ہو تو وہ مباح ممنوع ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جس امر مباح مندوب کا سبب عوام کے اعتقاد میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا اس طرح کرنا ممنوع ہے کہ اس کو تغییر حکم شرعی کا لازم ہو جائے۔ عند العوام اور دفع فتنہ عوام کا حتی الامکان واجب ہے"۔ [1]

نیز فرماتے ہیں:

"اگر ۔۔۔۔۔۔ عوام کو فساد عقیدہ حاصل ہو تو اس کا ترک کرنا لازم ہے اگر وہ امر استحباب کے درجہ میں ہو نہ سنت موکدہ اور واجب کے"۔ [2]

اس ضابطہ کی چند نظائر بیان کرتے ہوئے حضرت گنگوہی رح فرماتے ہیں:

"سنو خاتم بائیں ہاتھ میں صحابہ رض کے قرن میں مباح تھی پیچھے بوجہ مشابہت روافض کے یہ بھی فتنہ ہے لقولہ من تشبہ بقوم فہو منہم مکروہ تحریمی ہوئی، ہدایہ دیکھ لو۔ پس یسار کا تختم اور یمین کا تختم دونوں جائز، اور قرون ثلثہ میں یمین کا مباح رہا اور پھر یسار کا مکروہ ہوا تو ترک تختم یسار واجب ہوا کہ ترک مکروہ واجب ہے۔۔۔ بحق فلاں کہنا، اوّل مباح تھا۔ فقہاء نے ترک کو اس کے واجب کیا بسبب فتنہ عوام اور شیوع مذہب معتزلہ کے کہ ان کے نزدیک حق علی اللہ ہے ثواب مطیع اور عذاب عاصی"۔ [3]

محض "سدّ الذرائع" بعض دفعہ مباحات، ممنوعات کی صف میں داخل ہو جاتے ہیں علامہ ابراھیم بن موسیٰ رح شاطبی صاحب الاعتصام نے اس سلسلہ میں نہایت ہی قیمتی بحث کی ہے فرماتے ہیں:

---

[1] براہین قاطعہ ص ١١٨

[2] " " ص ١١٨

[3] سبیل الرشاد۔ تالیفات رشیدیہ ص ٥٣١

قد یکون اصل العمل مشروعًا ولکنه یصیر جاریا مجری البدعة من باب الذرائع

بعض دفعہ اصل عمل مشروع ہونے کے باوجود سدِ ذرائع کے طور پر بدعت کے درجے میں آجاتا ہے۔

نظائر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ولاجله ایضًا نهیٰ اکثرهم علی اتباع الاٰثار کما خرج الطحاوی وابن وضاح وغیرهما عن معزوز بن سوید الاسدی قال وافیت الموسم مع امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی الله عنه فلما انصرفنا الی المدینة انصرفت معه فلما صلی لنا صلاة الغداة فقرأفیها "الم ترکیف فعل ربك" و" لاٴیلاف قریش" ثم رأی اناسًا یذهبون مذهبًا فقال این یذهب هٰؤلاء قالوا یأتون مسجدًا هٰهنا صلی فیه رسول الله علیه وسلم فقال انما هلك من کان قبلکم بهٰذا یتبعون اٰثار انبیاءهم فاتخذوها کنائس وبیعا من ادرکته الصلوٰة فی شئ من هٰذه المساجد التی صلی فیها رسول الله صلی الله علیه وسلم فلیصل فیها والا فلا یتعمدها وقال ابن وضاح سمعت عیسیٰ بن یونس مفتی اهل طرسوس

اسی بنیاد پر اکثر علماء نے "آثار" کی زیارت کو منع قرار دیا ہے جیساکہ طحاوی اور ابن وضاح وغیرہ نے معزوز بن سوید اسلمی سے بیان کیا ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا میں موسم حج میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا۔ جب ہم مدینہ کو چلے تو میں نے حضرت عمرؓ کا ساتھ اختیار کیا انہوں نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی جس میں "الم ترکیف فعل ربك اور لاٴیلف قریش" پڑھا پھر انہوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو کسی طرف جارہے تھے۔ پوچھا یہ حضرات کدھر جارہے ہیں لوگوں نے بتلایا یہ حضرات یہاں ایک مسجد میں آتے رہتے ہیں، اس مسجد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی تھی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا، تم سے پہلے کے لوگ اسی بنیاد پر ہلاک ہوئے وہ اپنے انبیاء کے نشانات پر جاتے اور اس کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے۔ جس آدمی کو نماز کا وقت ایسی مساجد میں مل جائے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی ہے تو اس میں نماز

يقول امر عمر بن خطاب رضى الله عنه بقطع الشجرة التى بويع تحتها النبى صلى الله عليه وسلم فقطعها لان الناس كانوا يذهبون فيصلون تحتها فخاف عليهم الفتنة .... وقد كان مالك رح يكره المجئ الى البيت المقدس خيفة ان يتخذ ذالك سنة وكان يكره مجئ قبور الشهيد ويكره مجئ قباء خوفا من ذالك مع ماجاء فى الآثار من الترغيب فيه ولكن لما خاف العلماء عاقبة ذالك تركوه۔

پڑھ لے ورنہ ان کا قصد نہ کرے .... اور ابن وضاح نے کہا کہ میں نے عیسیٰ بن یونس مفتی اہل طرسوس سے فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کاٹ دینے کا حکم دیا تھا جس کے نیچے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی گئی تھی اس لئے کہ لوگ جاتے تھے اور اس کے نیچے نماز پڑھتے تھے تو حضرت عمر رض نے ان کے سلسلہ میں فتنہ کا خوف کیا ------ اور امام مالک رح بیت المقدس کی طرف جانا ناپسند کرتے تھے۔ محض اس اندیشہ سے لوگ اسے ایک سنت نہ بنالیں، اور اسی طرح شہدائے کرام کی قبروں اور قبا کی طرف بھی جانے سے گریز کرتے تھے حالانکہ اس سلسلہ میں ترغیبی آثار بھی وارد ہوئے ہیں۔ لیکن علماء نے انجام کے خوف سے اسے ترک کردیا۔

چند سطور بعد تحریر فرماتے ہیں :

وقال سعيد بن حسان كنت اقرأ على ابن نافع فلما مررت بحديث التوسعة ليلة عاشوراء قال لى حوق عليه قلت ولم ذالك يا ابا محمد ؟ قال خوفا من ان يتخذ سنة۔ فهذه الامور جائزة او مندوب اليها ولكنهم كرهوا فعلها خوفا من

سعید بن حسان کہتے ہیں کہ میں علی بن نافع کے پاس حدیث پڑھ رہا تھا جب شب عاشوراء میں توسع والی حدیث کو پڑھا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا، اس حدیث کو قلم انداز کردو میں نے کہا، اے ابو محمد یہ کیوں ؟ انہوں نے کہا اس خوف سے کہ کہیں اسے ایک رواج نہ بنا لیا جائے، تو یہ امور جائز یا مندوب تھے

لیکن لوگوں نے اس کو ناپسند قرار دیا محض اندیشۂ بدعت کی بنیاد پر۔

اس بحث پر مزید تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

مستحسن پر غیر مستحسن کی ترجیح

بنظر مزید توضیح یہ امر اور بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ شرع میں یہ امر کثیر الوقوع ہے کہ بعض چیزیں اصل سے مباح بلکہ مستحسن ہوتی ہیں۔ مگر بعض امور خارجہ امر غیر مستحسن کو ترجیح دینی مستحسن ہو جاتی ہے اور اس وقت میں بھی جانب مستحسن ہی کو ترجیح دینا ان کا کام ہے جو عقل دوربین نہیں رکھتے اور حدیث میں اس قسم کے امور بکثرت ملیں گے۔

دیکھئے! احادیث صحیحہ میں یہ امر موجود ہے کہ بوقت نزولِ قرآن مجید جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب باری میں مکرر سہ کرر عرض معروض کر کے قرآن مجید کے سات حروف مشہورہ پر پڑھنے کی اجازت لی، اور حضرت عثمان رضی کے زمانہ خلافت میں حسب رائے اور استحسانِ جماعت صحابہ بوجہ ظہور وانتشارِ اسلام و قرآن فی بلاد العجم ــــــ اس توسع کو ــــــ کہ جس کو خاتم النبیین نے باصرار و دعائے مکررہ بوجہ مصلحتِ امت جناب باری سے حاصل کیا تھا، اور جن حروف کی شان میں حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فکل حرفٍ شافٍ کافٍ فرمایا تھا ــــــ موقوف کر دیا اور حضرات صحابہ نے اس توسیع کے عوض اس زمانہ کے مناسب حال سمجھ بوجھ کر قرأت قرآن کو منحصر فی حرفِ واحدِ فرما دیا۔ رئیس المجتہدین تو شاید حضرات صحابہ رضی پر بھی طعن کریں کہ سب صورِ مباح کو ترک کر کے فی صورۃ واحدۃ کیوں کیا؟

اور سنئے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا جی چاہتا تھا کہ بنائے کعبہ کو گرا کر بنائے ابراہیمی کے مطابق تیار فرما دیں، مگر بعض مسلمانوں کے انکار اور دین کے پھر جانے کے خوف کی وجہ سے آپ رک گئے۔ چنانچہ الفاظ حدیث

---

۱ الاعتصام جلد ۲ صفحہ ۹۲-۹۵-۹۷۔

اس پر شاہد ہیں، باوجودیکہ آپ امر کو مستحسن سمجھتے تھے مگر فقط بدیں خیال کہ یہ امر کوئی مقصود فی الدین نہیں، اور اس کے نفع کے مقابلہ میں بڑے نقصان کا اندیشہ ہے اسلئے اس امر کو گو عمدہ تھا ترک فرمایا۔

علاوہ ازیں حدیثوں سے زمانہ نبوی میں عورتوں کا نماز کے لئے مسجدوں میں جانا ثابت ہوتا ہے اور یہ امر ثبوت اباحت امر مذکور کے لئے دلیل کافی ہے۔ پھر دیکھئے باوجود اس کے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع فرمایا اور عورات مسلمین اس امر کی شکایت جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں لے گئیں، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں باوجودیکہ ہم مسجد میں چلی آیا کرتی تھیں مگر اب ہم کو مساجد میں جانے سے روکا جاتا ہے، تو حضرت عائشہ رض نے بھی یہی فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورات کے اس حال کو ملاحظہ فرماتے تو بے شک مساجد میں آنے جانے سے منع فرما دیتے۔ اس کے سوا اور بہت سے امور خاص حدیث میں اس قسم کے ملتے ہیں[1]۔

قرون اولیٰ کے بعد جب شہوت پرستی اور اتباع ہویٰ نے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا شروع کر دیا حکم خدا اور رسول کے بجائے حرام و حلال کا پیمانہ لوگوں کی خود اپنی ہی طبائع اور خواہشات بن گئیں تو فقہاء امت نے بین طور پر محسوس کیا کہ اس صورت حال میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ کھلا رہا تو بہت سے لوگ دیدہ و دانستہ اور بہت سے لوگ غیر شعوری طور پر اتباع نفس و ہویٰ اور خواہش پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مثلاً ایک شخص کا سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابو حنیفہ رہ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ امام شافعی رہ کے نزدیک نہیں ٹوٹا۔ وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعی رہ کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا۔ پھر اس نے کسی عورت کو مس کر لیا تو امام شافعی رہ کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا۔ اور امام ابو حنیفہ رہ کے نزدیک برقرار رہا۔ اس کی نفس پرستی اس موقع پر امام ابو حنیفہ کی تقلید پر آمادہ کرے گی اور پھر بے وضو ہی نماز پڑھ لے گا۔ غرض جس امام کے قول میں اسے اپنا نفسانی فائدہ

---

[1] ایضاح الادلہ ص ۲۲۳۔

اور آرام نظر آئے گا۔ اس کو اختیار کرے گا اور جس میں اپنی خواہشات کی رو برآری نظر نہیں آئیگی اسے ترک کردے گا۔ اس طرح سے احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا کھلونا بن کر رہ جائیں گے اس لئے سد ذریعہ کے طور پر علماء کرام نے تقلید مخیرہ کے دونوں افراد میں سے شخصی کو متعین اور غیر شخصی کو ممنوع قرار دے دیا، بخلاف قرون اولیٰ کے کہ غلبہ خیر کی بنیاد پر ان مفاسد کا احتمال بعید تھا ساتھ ہی ساتھ مختلف فقہاء اور مجتہدین کے مسالک مرتب اور مدون نہیں تھے کہ ایک خواہش پرست اور رخصتوں کا متلاشی انسان، مختلف مسالک کی رخصتوں کو بآسانی تلاش کرلیتا۔ نیز مذاہب کا مکمل طور پر مدون نہ ہونا تقلید شخصی کی تعیین کے سلسلہ میں مانع تھا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر شخصی اور غیر شخصی دونوں کا شیوع تھا۔

شیخ الاسلام علامہ نووی رح فرماتے ہیں، (اس تقلید شخصی کے لازم ہونے) کی وجہ یہ ہے

ووجهه انه لوجاز اتباع ای مذهب شاء لافضیٰ الی ان یلتقط رخص المذاهب متبعا هواه ویتخیر بین التحلیل والتحریم والوجوب والجواز وذالك یودی الی انحلال ربقة التكلیف بخلاف العصر الاول فانه لم تكن المذاهب الوافیة باحكام الحوادث مهذبة فعلیٰ هٰذا یلزمه ان یجتهد فی اختیار مذهب یقلده علی التعیین[1]

کہ اگر اس بات کی اجازت ہو کہ انسان جس فقہی مسلک کی چاہے پیروی کرلیا کرے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ہر مذہب کی آسانیاں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق ان پر عمل کرلیا کریں گے، حلال و حرام اور واجب و جائز کے احکام کا سارا اختیار خود لوگوں کو مل جائے گا اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بالکل کھل کر رہ جائیں گی، البتہ پہلے زمانے میں تقلید شخصی اس لئے ممکن نہ تھی کہ فقہی مذاہب مکمل طور پر مدون اور معروف نہ تھے (لیکن اب جب کہ مذاہب فقہیہ مدون اور مشہور ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ کوشش کر کے ایک مذہب کو اختیار کرلے اور پھر متعین طور پر اسی کی تقلید کرے کرے۔

---

[1] المجموع شرح المہذب جلد ۱ صا۹۱ بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت۔

امام نووی رح نے جو یہ فرمایا کہ اگر آدمی کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جب چاہے جس مجتہد کا قول اپنا لیا کرے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حلال و حرام ایک ہو جائیں اور احکام شرعیہ کی پابندیوں سے آدمی بالکل ہی آزاد ہو جائے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ:

"عہد صحابہ کرام رض سے اب تک بے شمار فقہاء و مجتہدین پیدا ہوئے اور اہل علم پر یہ بھی پوشیدہ نہیں، کہ ہر فقیہ کے مذہب میں کچھ ایسی آسانیاں ملتی ہیں جو دوسروں کے یہاں نہیں ہیں۔ اور یہ حضرات کچھ معصوم بھی نہیں تھے کہ اغلاط سے محفوظ ہی رہتے بلکہ ہر ایک کے یہاں دو ایک چیزیں ایسی بھی مل جاتی ہیں۔ جو مسلک جمہور کے خلاف ہیں تو اگر تقلید مطلق کی اجازت عام دے دی جائے تو خواہشات کے پیرو حضرات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے مسائل نکالیں اور ان کی تقلید کر کے دین فطرت کو احکام خداوندی نہیں بلکہ خواہشات نفسانیہ کا مجموعہ بنا دیں مثلاً فقہ شافعی میں جواز شطرنج کا قول ہے عبداللہ بن جعفر کی طرف منسوب ہے کہ وہ غنا، و مزامیر کے جواز کے قائل تھے" [۱]

حضرت قاسم ابن محمد سے منقول ہے کہ:

"وہ بے سایہ تصویروں کو جائز قرار دیتے تھے" [۲]

امام اعمش کی طرف منسوب ہے کہ:

ان کے نزدیک ابتداء صوم طلوع فجر کے بجائے طلوع آفتاب سے ہوتی ہے.....

.....چنانچہ تفسیر روح المعانی میں علامہ آلوسی رح نے روزے کا مسئلہ بیان کرنے کے بعد اعمش کا یہ مذہب بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"خالف ذالك الاعمش ولا يتبعه الا الاعمى" [۳]

---

[۱] اتحاف الزبیدی جلد ۶ ص ۲۵۸ بحوالہ تقلید کی شرعی حیثیت ص ۶۷۔

[۲] نووی شرح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۹، [۳] روح المعانی جلد ۲ ص ۱۸۷۔

اس مسئلہ کی اعمش نے مخالفت کی ہے حالانکہ ان کی بات کوئی اندھا ہی تسلیم کر سکتا ہے۔

داؤد ظاہری رح اور ابن حزم رح کا مسلک یہ ہے کہ :

"اگر کسی عورت سے نکاح کا ارادہ ہو تو اسے برہنہ دیکھنا بھی جائز ہے"۔ [1]

اب ایک خواہش نفس کے ہاتھوں اندھا انسان تقلید مطلق کی اجازت پا کر اپنی ان تمام مرغوبات کو بآسانی تلاش کر لے گا اور تقلید کے پردے میں دین و شریعت کو ایک افسانۂ رنگارنگ بنا دے گا اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح کان شر عباد اللّٰہ بدترین بندگانِ خدا میں شامل ہو جائے گا۔

علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں :

لو فتح لهم هذا الباب لانحلت عرى المذهب [3]

اگر لوگوں کے لئے (تقلید مطلق) کا دروازہ کھول دیا جائے تو مذہب کی چولیں ہل جائیں گی۔

علامہ ابن تیمیہ رح تقلید مطلق کے مفاسد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

وفی وقت يقلدون من يفسده وفی وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوىٰ ومثل هذا لا يجوز باتفاق الامة۔

یہ لوگ اپنی غرض اور خواہش نفسانی کے لئے ایک وقت اس کی تقلید کرتے ہیں جو دفاسق گواہوں کے ذریعہ منعقدہ نکاح کو فاسد قرار دیتا ہے۔ اور دوسرے وقت اُس کی تقلید کرتے ہیں جو اسے صحیح کہتا ہے یہ باتفاق امت ناجائز ہے۔

چند سطروں کے بعد پھر لکھتے ہیں :

ونظير هذا ان يعتقد الرجل ثبوت شفعة الجوار اذا كان طالبًا لها و

اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی آدمی جس وقت کسی حقِ شفعہ کا خود طالب ہو (مذہب امام ابو حنیفہ رح کے

---

[1] فتح الملہم ج ۳ ص ۴۷۶؛

[2] عقد الجید ص ۶۳؛

[3] الموافقات ج ۴ ص ۱۴۶۔

عدم ثبوتها اذا كان مشتريا فان هذا لا يجوز بالاجماع وكذا من بنى صحة ولاية الفاسق فى حال نكاحه وبنى على فساد ولايته حال طلاقه لم يجز ذالك باجماع المسلمين ولو قال المستفتى المعين انا لم اكن اعرف ذالك وانا اليوم التزم ذالك لم يكن من ذالك لان ذالك يفتح باب التلاعب بالدين ويفتح الذريعة ان يكون التحريم والتحليل بحسب الاهواء [1]

مطابق) شفعہ جواز کے ثبوت کا اعتقاد ظاہر کرے اور اگر مشتری ہو، اور دوسرا شخص طالب شفعہ ہو تو (مذہب امام شافعی رہ کے مطابق) اس کے عدم ثبوت کا معتقد بن جائے۔ یہ بالاجماع جائز نہیں۔ ایسے ہی وہ شخص جو بحالت قیام نکاح ولایت فاسق کی صحت کا قائل ہو (اور اس کی بنا پر منافع نکاح سے منتفع ہو) مگر جب طلاق ثلٰثہ دیدے تو حرمتِ غلیظہ سے بچنے کے لئے ولایت فاسق کو کالعدم کہہ کر اس کے ماتحت منعقد شدہ نکاح کو فاسد قرار دے یہ باجماعِ مسلمین جائز نہیں، اگر کوئی مستفتی یہ کہے کہ پہلے مجھے اس مذہب کی خبر نہ تھی اور اب میں اس کا معتقد اور پابند ہوں تو بھی اس کا قول قابل تسلیم نہ ہوگا کیوں کہ یہ دین کو ایک کھلونا بنانے کا دروازہ کھولنا ہے اور اس کا سبب بنتا ہے کہ حلال وحرام کا مدار محض خواہشاتِ نفس پر ہوجائے۔

انھیں مفاسد عظیمہ کے پیش نظر علماء امت نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ اب تقلید شخصی ہی واجب ہے تاکہ انسان نفس وہوٰی کے مکائد سے محفوظ ومامون ہوکر شریعت غرّا کی مکمل اتباع کے ساتھ زندگی گذار سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

واعلم ان الناس كانوا فى المائة الاولى والثانيه غير مجتمعين على

یاد رکھئے کہ پہلی دوسری صدی میں تمام لوگ کسی ایک معین مذہب کی تقلید پر مجتمع نہیں

---

[1] فتاوٰی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۲۴۱۔

التقلید بمذھب واحد بعینه ..... وبعد المائتین ظھر فیھم التمذھب للمجتھدین باعیانھم وقل من کان لایعتمد علی مذھب مجتھد بعینه وکان ھذا ھو الواجب فی ذالک الزمان[1]

تھے .... اور دوسری صدی کے بعد ان میں ایک مجتہد کو متعین کر کے اسی کے مذہب پر عمل کرنے کا رواج ہوا یہاں تک کہ اس وقت ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو کسی ایک مجتہد کے مذہب پر اعتماد نہ کرتے ہوں اور اس زمانے میں یہی چیز واجب تھی۔

صاحب انتصار الحق رح فرماتے ہیں :

”زمانہ ائمہ مجتہدین میں مذاہب مدون ہو گئے اور مذہب ہر مجتہد کا حوادث ضروری مقلدین کو جامع ہو گیا اور نفوس پر اتباع ھوا غالب آیا اس سبب سے تعین تقلید کو واجب کیا کہ بغیر اس کے ادائے احکام الٰہیہ عوام الناس کو بہت دشوار ہے چنانچہ اس مضمون کو خیر الدین ابی الفتح بغدادی نے کتاب الاصول میں مصرح فرمایا ہے[2]

دوسری جگہ علامہ شعرانی رح کے حوالہ سے فرماتے ہیں :

قال الشعرانی فی المیزان فان قلت فھل یجب علی المحجوب عن الاطلاع علی العین الاولی للشریعة التقلید بمذھب معین فالجواب نعم وذالک لئلا یضل فی نفسه ویضل غیره[3]

علامہ شعرانی رح میزان میں فرماتے ہیں ”اگر تم یہ سوال کرو کہ کیا شریعت کے اصل سرچشمہ کی اطلاع سے محروم شخص کیلئے تقلید معین واجب ہے تو جواب یہی ہے کہ ہاں واجب ہے اور یہ اس لئے کہ تاکہ وہ ضال اور مضل نہ بن سکے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بڑی تفصیل کے ساتھ تقلید معین کے فوائد اور تقلید مطلق کے مفاسد پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

---

[1] الانصاف ص ۵۷-۵۹ ؛　[3] انتصار الحق ص ۲۱۹ ۔

[2] انتصار الحق بجواب معیار الحق ص ۱۵۳ ؛

"گوفی نفسہ یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو، مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا، اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا، تو اس طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفسہ جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام ابوحنیفہ رح سے پوچھ لیا، کبھی اوزاعی رح سے۔ اور سلف کی اسی حالت کو دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لالچ ہوتا ہے سو فی نفسہ تو یہ جائز ہے، مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہوگیا۔ اس کو سمجھنے کے لئے ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ کہ ...... حالتِ غلبہ کا اعتبار ہوتا ہے، سو حالت غلبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں یہ فرق ہے کہ اس دن کے لوگوں میں تدیّن غالب تھا، ان کا مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو اتفاقی طور پر ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ جس قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے، پس اگر تدیّن کی وہی حالت اب بھی ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہ رہی اور کیسے رہتی۔ حدیث میں ہے ثم یفشوا الکذب، کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا، اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی۔ سو جتنا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی ابتری ہوتی گئی، اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب ہے، اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو اس پر عمل کریں گے، ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے۔ وہاں کے ایک مرد کا ایک عورت سے نکاح ہوا، پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا، ان کا نکاح جائز نہیں۔ ان میں جدائی کرا دو۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی، اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے۔ میں نے کہا کہ اول تو تفریق میں بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں کہ لوگ کہیں گے ...... کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے۔ دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کہنے لگے اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا۔ میں نے کہا خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو حرمت کے حق میں یکساں ہے

جب میرے پاس انہیں جواب ملا تو وہ دہلی پہونچے، وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے۔ مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے ایک عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی، پس آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ دو گھونٹ پیا تھا حرمت ثابت ہوئی یا نہیں۔ انہوں نے جواب لکھ دیا : لاتحرم المصّۃ والمصّتان۔ اب بہت خوش ہوئے اور ان میاں بیوی کو وہ فتویٰ لاکر دے دیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کر لیا جائے گا تو کونسی خرابی ہے۔ آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے، بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندۂ خدا! تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے دو گھونٹ پیے تھے۔ اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی ہو تو اس کی وجہ سے ان کے فتوے کو تو مانا جنہوں نے حلال بتایا، اور ان کے فتوے کو نہ مانا جنھوں نے حرام بتایا، حالانکہ جنھوں نے حلال بتایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اول تو یہ شخص ان کے مذہب پر نہ تھا جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو ان کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی، اور افسوس ہے کہ بعضے اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے، مگر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ انما الاعمال بالنیات کہ نیت کا اعتبار ہے، سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی رح نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیغام بھیجا۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رفع یدین اور آمین

بالجہر کیا کرو، فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا، اور نکاح ہو گیا، اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انھوں نے اس کو سن کر سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا، مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہنے کا خوف ہے، اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا۔ بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہو گئی ہے۔ ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہو گا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے مطلب کی پاویں گے اختیار کریں گے۔ مثلاً اگر وضو کرنے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابو حنیفہ رہ کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی رہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا، سو یہاں یہ تو شخص شافعی مذہب اختیار کر لے گا اور پھر اس نے بیوی کو بھی ہاتھ لگایا، تو شافعی رہ کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا، اور امام ابو حنیفہ رہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا۔ حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا۔ امام ابو حنیفہ رہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے وضو ٹوٹ گیا۔ اور امام شافعی رہ کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے۔ مگر اس شخص کو ذرا پرواہ نہ ہو گی، ہر امام کی رائے کو وہ اس میں قبول کرے گا، جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا۔ سو دین تو رہے گا نہیں غرض پرستی رہ جائے گی۔ بس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں۔ ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ان میں تدین غالب تھا۔ اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے۔ بخلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے ہم سہولت اور غرض کے بندے ہیں اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں۔ ہم تقلید شخصی کو فی نفسہ واجب یا فرض نہیں کہتے ہیں بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہب سے احوط کو تلاش کر کے عمل کرے گا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر آسان کو تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جائے گا۔ بس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسا کہ مجتہدین کی تقلید شخصی

میں یہ حکمت ہے۔ اسی طرح اس مذہب کے علماء اخیار میں سے ایک ہی کو متعیّن کر لینے میں یہی حکمت ہے کیونکہ زمانہ کی حالت بدل گئی ہے کہ لوگوں پر غرض پرستی غالب ہے اور ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف ہے پس اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں پڑ جاویں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا" [۱]

صاحبؒ اعلاء السنن فرماتے ہیں :

وبهذا تبين سر ما ذهب اليه الفقهاء من عدم جواز ترك مذهب الى مذهب لان هذا ان كان على وجه التخطية للمذهب المتروك فهو ليس باهل لها وان كان على وجه الترجيح فهو ايضا ليس من اهله فلا وجه للانتقال الا لهوى او شئ لا يعتد به فلا يجوز لاسيما اذا كان هذا الصنيع يفتح عليه باب اتباع الشهوات [۲]

ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول کے عدمِ جواز کے سلسلہ میں فقہاء کے نظریہ کا راز اس سے ظاہر ہو گیا کیوں کہ یہ چیز اگر مذہب متروک کو غلط قرار دینے کی وجہ سے ہو تو وہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے اور اگر بر بنائے ترجیح ہو تو وہ شخص اس کا بھی اہل نہیں۔ تو اب انتقال مذہب کی وجہ بجز خواہش پرستی اور فضول کے کچھ اور نہ ہو گی تو یہ چیز جائز نہ ہو گی، خصوصاً جب کہ اس سے اتباع شہوات کے دروازے کھلتے ہوں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ فرماتے ہیں :

"الغرض اتباع ہوی باجماع امت حرام ہے اور ادھر یہ بات تجربہ سے محسوس ومشاہد ہے کہ اگر عوام کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس مسئلہ میں چاہیں ابو حنیفہؒ کے مذہب پر عمل کریں اور جس میں چاہیں شافعی رحؒ کے مذہب پر، پھر جب چاہیں مالکیہ کا قول

---

[۱] اشرف الجواب حصہ دوم ص ۱۲۲۔ [۲] مقدمہ اعلاء السنن جلد ۲ ص ۶۴۔

لے لیں، اور جب چاہیں حنابلہ یا دوسرے ائمۂ مجتہدین کا، تو انجام اس کا لازمی طور پر وہی ہو گا جس کو حافظ ابن تیمیہ رح نے باجماع مسلمین حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔ اس شرعی مصلحت کی بناء پر عافیت اسی میں دیکھی گئی کہ امام واحد کا اتباع تمام مسائل میں لازم قرار دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل مقصود اتباع ہوئی سے بچنا ہے اور چونکہ اسکی تدبیر اس ہوئی پرستی کے زمانے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ عمل کرنے والوں کو آزاد نہ چھوڑا جائے بلکہ امام واحد کی تقلید پر مجبور کیا جائے۔ اس لئے تقلید شخصی بوجہ ذریعہ مقصود ہونے کے واجب قرار دی گئی"۔[1]

ترک تقلید کے قبیح نتائج کا اعتراف کرتے ہوئے خود غیر مقلد حضرات کے پیشوا مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی رح اپنے رسالہ "اشاعۃ السنہ" جلد ۱۱ شمارہ ۱۱ ص ۵۳ میں تحریر فرماتے ہیں:

"پچیس برس کے تجربہ کے بعد سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق اور تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ بالآخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں، ان میں سے بعض عیسائی ہو جاتے ہیں اور مذہب لا مذہب جو کسی دین و مذہب کے پابند نہیں رہتے اور احکام شریعت سے فسق وخروج تو اس آزادی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ ان فاسقوں میں بعض تو کھلم کھلا جمعہ جماعت اور نماز، روزہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، سود شراب سے پرہیز نہیں کرتے اور بعض جو کسی مصلحت دنیاوی کے باعث فسق ظاہری سے بچتے ہیں وہ فسق خفی میں سرگرم رہتے ہیں، ناجائز طور پر عورتوں کو نکاح میں پھنسا لیتے ہیں، کفر وارتداد اور فسق کے اسباب دنیا میں اور بھی بکثرت موجود ہیں، مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ علم کی کمی کے باوجود تقلید چھوڑ بیٹھتے ہیں"۔[2]

مقلد اور غیر مقلد دونوں قسم کے علماء کرام کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی۔

---

[1] جواہر الفقہ حصہ اول ص ۱۵۳۔

[2] بحوالہ سبیل الرشاد مصنفہ حضرت گنگوہی رح ص ۹۔

کہ تقلید شخصی سے انحراف کرنا طرح طرح کے فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی تقلید شخصی کے وجوب کو تسلیم نہ کرے تو اس کی بنیاد صرف دو چیزیں ہو سکتی ہیں۔

۱: یا تو وہ شخص اتباع ہوی اور خواہشات نفس کی پرستش میں مبتلا ہے جس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں۔

۲: یا وہ شخص صلاحیت اجتہاد سے تہی دامن ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مجتہد سمجھتا ہے۔

اور یہ دونوں چیزیں نہایت خطرناک اور امت مسلمہ کو راہ خیر اور صراط مستقیم سے محروم کر کے فساد و شر کی مختلف راہوں میں بکھیر دینے والی ہیں، اس حقیقت کو مکمل وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لئے اختلاف امت کے اقسام اور اس کے اسباب پر ایک تفصیلی نظر ڈالنی مناسب ہے

اختلافِ امت

قرآن و سنت میں بصراحت امت کے افتراق و انتشار کی خبر دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والے معیار صحیح کی بھی نشاندہی کی گئی .... علماء کرام نے افتراق امت کے مختلف اسباب بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے ہیں جن کی بنیاد پر جادۂ حق سے منحرف ہونے والے تمام فرقوں کو تعیین و تفہیم نیز راہ حق کی توضیح و تفسیر میں بصیرت اور اطمینان کلی کا سرمایہ حاصل ہوتا ہے .... ارشاد ربانی ہے:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ؛ (سورۂ انعام پ۸)

اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو تم لوگ اسی کی اتباع کرو، اور مختلف راستوں کی اتباع نہ کرو، ورنہ تم کو یہ چیز اللہ کے راستہ سے پھیر دے گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی هریرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال تفرقت الیهود علی احدی وسبعین فرقة او ثنتین وسبعین فرقة والنصاری مثل ذلك وتفترق امتی علی ثلث وسبعین فرقة [1]

ابوہریرہ رض سے مروی ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور نصاریٰ کا بھی یہی حال ہوا اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائیگی۔

ترمذی کی دوسری روایت میں مزید تفصیل ہے :

وان بنی اسرائیل افترقت علی ثنتین وسبعین ملة وتفرق امتی علی ثلث وسبعین ملة کلهم فی النار الا ملة واحدة قالوا ومن هی یارسول الله؟ قال ما انا علیه واصحابی [2]

بے شک بنی اسرائیل بہتر ملتوں میں منقسم ہو گئے اور میری امت تہتر ملتوں میں منقسم ہو جائے گی ؛ اور ایک ملت کے علاوہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ رض نے سوال کیا، اے اللہ کے رسولؐ وہ (جنتی) کون ہوں گے، آپؐ نے فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کے راستہ پر ہوں گے۔

ان نصوص میں جس افتراق کی خبر دی گئی ہے وہ نظریات اور معتقدات کے مختلف ہو جانے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

"والتفرق ناش عن الاختلاف فی المذاهب والآراء" [3]

اختلاف کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں لیکن وہ عموماً تین بنیادوں پر ہوتا ہے۔

---

[1] جامع الترمذی ص۹۰ جلد ۲ ؛

[2] " " ص۸۹ " ؛

[3] الاعتصام ص۳ جلد ۳ ۔

اختلاف کی پہلی قسم :

یہ ہے کہ دین کے اصول اور کلیات ہی کے سلسلہ میں رائیں مختلف ہو جائیں ۔

علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں کہ :

واصل هذا الاختلاف هو فی التوحید والتوجه للواحد الحق سبحانه فان الناس فی عامة الامر لم یختلفوا فی ان لهم مدبرا یدبرهم وخالقا اوجدهم الا انهم اختلفوا فی تعیینه علی آراء مختلفة من قائل بالاثنین وبالخمسة وبالطبیعة او بالدهر او بالکواکب الی ان قالوا بالآدمیین وبالشجر وبالحجارة وما ینحتون بایدیهم[1]۔

دراصل یہ اختلاف توحید اور ذات واحد کی طرف توجہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا، لوگوں میں عموماً اس چیز کے اندر اختلاف نہیں ہوا کہ ان کے لئے کوئی مدبر ہے جو ان کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے، یا کوئی خالق ہے جس نے ان کو پیدا کیا بلکہ انھوں نے خالق کی تعیین کے سلسلہ میں اختلاف کیا، کوئی دو کا قائل ہوا کوئی پانچ کا، یا پھر طبیعت کا یا دھر یا کواکب کی خالقیت کا اعتقاد رکھا، یہاں تک کہ بعض لوگ آدمیوں، درختوں، پتھروں اور خود تراشیدہ چیزوں کو خالق مان بیٹھے ۔

آیت کریمہ :

ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذالك خلقهم ۔

اور یہ لوگ برابر اختلاف کرتے رہے مگر وہ لوگ جن پر تیرے رب نے رحم کیا اور اللہ نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ۔

انہیں لوگوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے، یہ لوگ رحمت خداوندی اور ہدایت ربانی سے سراسر محروم ہیں ۔

---

[1] الاعتصام جلد ۳ ص ۵ ۔

علامہ شاطبی رح تحریر فرماتے ہیں :

ومنهم من اقر بواجب الوجوب الحق
لكن على آراء مختلفة ايضاً الى ان
بعث الله تعالىٰ الانبياء مبينين
لامرهم حق ما اختلفوا فيه من
باطله على ما ينبغي ونزهوا رب
الارباب عما لا يليق بجلاله من
نسبة الشركاء والانداد واضافة
الصاحبة والاولاد فاقر بذلك
من اقر به وهم الداخلون تحت
مقتضى قوله "الا من رحم ربك"
وانكر من انكر فصار الى مقتضى
قوله "وتمت كلمة ربك لاملأن
جهنم من الجنة والناس اجمعين"
وانما دخل الاولون تحت وصف
الرحمة لانهم خرجوا عن وصف
الاختلاف الى وصف الوفاق والالفة
وهو منقول عن جماعة من المفسرين
وخرج ابن وهب عن عمر ابن
عبد العزيز انه قال في قوله تعالىٰ
"ولذلك خلقهم" خلق اهل
الرحمة ان لا يختلفوا وهو معنى
ما نقل عن مالك وطاؤس في جامعه

ان میں سے بعض نے واجب الوجوب تعالےٰ
کا اقرار کیا، لیکن ان کی رائیں مختلف رہیں یہاں
تک کہ اللہ تعالےٰ نے انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمایا
جنھوں نے اپنی امتوں کے سامنے مختلف فیہ
چیزوں میں حق اور باطل کو مکمل واضح فرمایا
اور رب العالمین کی شرکاء انداد بیوی اور اولاد
اور ان تمام چیزوں سے تنزیہہ فرمائی جو جلالت
خداوندی کے شایان شان نہ تھیں، تو تسلیم
کرنے والوں نے اس کو تسلیم کیا، اور یہی وہ
لوگ جو "الا من رحم ربك" کے تحت
داخل ہیں ۔ اور منکرین نے انکار کیا اور تمت
کلمة الخ (آپ کے رب کا فیصلہ پورا ہو چکا
کہ ہم ضرور بالضرور ایسے انسانوں اور جناتوں
کو جہنم میں داخل کر دیں گے) کے مصداق ہو گئے
پہلے لوگ رحمت سے اس لئے ہمکنار ہوئے
کہ وہ اختلاف سے بچ کر اتفاق اور الفت
اختیار کرنے والے تھے ۔ مفسرین کرام کی ایک
جماعت سے آیت کی یہی تفسیر منقول ہے ۔
ابن وہب نے آیت کریمہ "ولذلك
خلقهم" کی تفسیر میں عمر ابن عبد العزیز کا
قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اہل رحمت
کو اسی لئے پیدا ہی کیا ہے کہ وہ اختلاف سے

وبقی الآخرون علی وصف الاختلاف اذ خالفوا الحق الصریح ونبذوا الدین الصحیح [1]

دور رہیں، یہی معنی مالک اور طاؤس سے بھی منقول ہیں اور بقیہ لوگ حق صریح کی مخالفت اور دین صحیح کو پسِ پشت ڈالنے کی وجہ سے صفتِ اختلاف ہی پر رہے ۔

اختلاف کی دوسری قسم :

بعض دفعہ اختلاف اصول وکلیات کے بجائے جزئیات اور فروع کے اندر ہوتا ہے ۔

ثم ان ہؤلاء المتفقین قد یعرض لہم الاختلاف بحسب القصد الثانی لا القصد الاول" [2]

پھر یہ کلیات دین میں متفق حضرات بعض دفعہ قصد ثانی یعنی جزئیات کے اعتبار سے اختلاف کر لیتے ہیں نہ کہ قصد اول یعنی کلیات کے اعتبار سے ۔

یہ اختلاف مسائل اجتہادیہ میں ہوتا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ عظام رح کے اختلافات .... علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں :

انا نقطع بان الخلاف فی مسائل الاجتہاد واقع ممن حصل لہم محض الرحمۃ وہم الصحابۃ ومن اتبعہم باحسان [3]

ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ مسائل اجتہادیہ میں اختلاف ان لوگوں میں بھی ہوا جو سراسر اہل رحمت ہیں یعنی صحابہ کرام رض اور ان کے سچے متبعین ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح تحریر فرماتے ہیں :

ثم انہم تفرقوا فی البلاد وصار کل واحد مقتدی ناحیۃ من النواحی

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد) صحابہ کرام رض تمام بلاد میں پھیل گئے اور ہر شخص ایک ایک حصہ

---

[1] الاعتصام ص۵-۶ جلد۳

[2] " ص۸ "

[3] الاعتصام ص۱۰ جلد۳ ۔

فكثرت الوقائع ودارت المسائل فاستفتوا فيها فاجاب كل واحد حسب ما حفظه اذا استنبط ما يصلح للجواب وان لم يجد فيما حفظه اواستنبط ما يصلح للجواب اجتهد برأيه وعرف العلة التى ادار رسول الله صلى الله عليه وسلم عليها الحكم فى منصوصاته فطردوا الحكم حيث وجدها لايألوا جهدًا فى موافقة غرضه عليه الصلوٰة والسلام فعند ذالك وقع الاختلاف بينهم [1]

کا مقتدا بن گیا، پس واقعات زیادہ پیش آتے گئے، اور لوگوں نے مسائل دریافت کرنے شروع کئے، ہر صحابی نے اپنی یادداشت اور استنباط کے موافق جواب دیا اور اگر انھوں نے اپنی یادداشت اور استنباط میں کوئی امر قابل نہ پایا تو اپنی رائے سے اجتہاد کیا اور اسی علت کو معلوم کیا جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مصرح احکام میں مدار علیہ قرار دیا تھا، پس انہوں نے جہاں اس علت کو پایا وہیں اس کا حکم متعین کر دیا اور حکم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کے مطابق کرنے میں کوئی کمی نہ کی، پس اس وقت ان کے درمیان اختلاف واقع ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صحابہ کرامؓ اور ائمہ مجتہدین کے ان اختلافات کو بڑے لطیف اور نفیس انداز میں تفصیلاً بیان کیا ہے ــــــ اس نوع کے اختلاف کو کسی بھی طرح مذموم اور غیر مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ علمائے امت کی تصریحات کے مطابق یہ اختلاف امت کے لئے رحمت ہے:

ان جماعة من السلف الصالح جعلوا اختلاف الامة فى الفروع رحمة...... روى عن قاسم بن محمد قال نفع الله باختلاف اصحاب رسول الله

سلف صالحین کی ایک جماعت نے فروع کے اندر امت کے اختلاف کو رحمت کہا ہے قاسم ابن محمد سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اختلافات

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صـ۳۳۲ جلد ۱

صلی اللہ علیہ وسلم فی العمل لایعمل العامل بعمل رجل منھم الارای انہ فی سعۃ ....

روی ابن وھب عن القاسم ایضًا قال لقد اعجبنی قول عمر ابن عبدالعزیز ما احب ان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لایختلفون لانہ لوکان قولا واحدًا لکان الناس فی ضیق وانھم ائمۃ یقتدی بھم فلو اخذ رجل بقول احدھم کان سنۃ ؎

کو عمل کے اندر نفع بخش بنایا ہے، عمل کرنیوالاان میں سے جس کے بھی طریقہ پر عمل کریگا اپنے کو وسعت کے اندر محسوس کریگا" نیز ابن وہب نے قاسم سے نقل کیا ہے کہ" مجھے عمر ابن عبدالعزیز کا یہ قول بہت پسند آیا اور مجھے یہ بات پسند نہیں کہ صحابہ کرام رض اختلاف نہ کرتے اس لئے کہ اگر ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑتے....

صحابہ کرام چونکہ رہنما اور مقتدا ہیں اس لئے ان میں سے جس کا بھی قول اختیار کیا جائے سنت ہوگا۔

اختلاف کی تیسری قسم :

اختلاف کی ان دونوں صورتوں کے درمیان ایک تیسری صورت ہے کہ اصل دین میں اتفاق کے باوجود دین کے بعض قواعد کلیہ اور مسائل اساسیہ میں اختلاف رونما ہوجائے، جس کی بنیاد پر لوگ مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہوجائیں، یہ وہی اختلاف ہے جس کی خبر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دی ہے کہ" میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائیگی علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

وبین ھذین الطریقین واسطۃ ادنیٰ من الرتبۃ الاولیٰ واعلیٰ من الرتبۃ الثانیۃ وھی ان تقع الاتفاق فی اصل

اور ان دونوں طریقوں کے درمیان ایک واسطہ جو پہلے سے کمتر اور دوسرے سے بدتر ہے وہ یہ ہے کہ اصل دین میں اتفاق کے

؎ الاعتصام صـ۱۱ـ جلد ۳

الذین ویقع الاختلاف فی بعض قواعدہ الکلیۃ وھو المؤدی الی التفرق شیعا .... ولذالک صح عنہ صلی اللہ علیہ وسلم ان امتہ تفرق علی بضع وسبعین فرقۃ [1]

باوجود دین کے بعض قواعد کلیہ میں اختلاف واقع ہو جائے اور یہی مختلف گروہ بندیوں کا سبب ہے، اسی بناء پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت الخ

امام ابواسحٰق ابراھیم ابن موسیٰ شاطبی رح نے اپنی مشہور و مستند کتاب "الاعتصام" اور شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح نے اپنی مایۂ ناز کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں اسی اختلاف کے اسباب وعلل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، جن میں یہ دو سبب بہت اہم ہیں؛

اختلاف کا پہلا سبب؛

اختلاف کا پہلا سبب یہ ہے کہ آدمی اپنے کو صاحب علم وفضل اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز خیال کرے اور فی الواقع اسے یہ درجہ حاصل نہ ہو؛ .... علامہ شاطبی رح فرماتے ہیں؛

احدھا ان یعتقد الانسان فی نفسہ اویعتقد فیہ انہ من اھل العلم والاجتھاد فی الدین ولم یبلغ تلک الدرجۃ ...... فتراہ احداً ببعض جزئیات الشریعۃ فی ھدم کلیاتھا حتی یصیر منھا ماظھر لہ فی بادی رأیہ من غیر احاطۃ بمعانیھا ولارسوخ فی فھم مقاصدھا [2]

پہلا سبب اختلاف کا یہ ہے کہ آدمی خود اپنے کو اہل علم اور اہل اجتہاد سمجھے یا دوسرے لوگ اس کے بارے میں یہ خیال کریں حالانکہ اسے یہ درجہ حاصل نہ ہو، تم ایسے شخص کو دیکھو گے کہ بعض دفعہ وہ شریعت کے کسی ایسے جزیۂ کو اختیار کر لیتا ہے جو اصل شریعت ہی کو منہدم کرنے والی ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ احکام شرعیہ کے معانی کا احاطہ اور مقاصد کا ادراک کئے بغیر ظاہر نظر میں سمجھ میں آنے والی چیزوں

---

[1] الاعتصام جلد ۳ صـ ۱۲ ، [2] الاعتصام جلد ۳ صـ ۱۴-۱۵ ۔

کو اختیار کرتا رہتا ہے

علم و فہم کی کمی کے باوجود اپنی رائے اور فیصلہ کو حرفِ آخر قرار دیتا ہے، **قرآن و حدیث** کے ضروری علوم استنباط و اجتہاد کے واجبی شرائط پورے حاصل کئے **بغیر احکام شرعیہ** اور **مسائل دینیہ** میں رائے زنی کر کے زیغ و ضلال اور افتراق و انتشار کے دروازے **کھولتا رہتا** ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس روش پر شدید تنبیہ فرمائی ہے:

۱:- عن عبد اللہ بن عمرو ابن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعه ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی ان لم یبق عالم من العباد اتخذ الناس رؤسا جهالاً فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا [1]

بے شک اللہ تعالیٰ علم نہیں اٹھائیں گے اس طور پر کہ دفعۃً بندوں سے چھین لیں۔ بلکہ علم اٹھائیں گے علماء کرام کو اٹھا کر یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہ جائے گا تو لوگ جاہل رہنماؤں کو اپنا لیں گے اور انھیں سے مسائل معلوم کئے جائیں گے اور یہ لوگ علم کے بغیر ہی جواب دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے۔

۲: عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعده من النار [2] (رواہ ترمذی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے قرآن کریم کے اندر بغیر علم کے رائے زنی کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

۳: عن ابی هریره قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من افتی

جس شخص کو غلط فتویٰ دیا گیا تو اس کا گناہ مفتی کے سر ہے۔

---

[1] البخاری کتاب العلم ص۲۰ جلد ۱ ترمذی ابواب العلم ص۹۰ جلد ۲ مسند حمیدی ص۲۶۵ جلد ۱

[2] بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۰ جلد ۱۔

بغیر علم کان اثمه علیٰ من افتاه[1] (رواه ابو داؤد)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علمائے امت رحمہ نے بھی دین میں جہلاء کی دخل اندازی کو منبع فتن قرار دیا ہے

قال ابن مسعود رضی الله عنه لایزال الناس بخیر ما اخذ والعلم من اکابرهم فاذا اخذوه من اصاغرهم وشرارهم هلکوا .... قال الباجی یحتمل الاصاغر من لاعلم عنده[2]

ابن مسعود فرماتے ہیں، لوگ اس وقت تک خیر میں رہیں گے جب تک علم، علماء سے حاصل کرتے رہیں اور جب چھوٹوں اور برے لوگوں سے علم حاصل کرنا شروع کر دیں گے تو ہلاکت میں پڑ جائیں گے .... باجی کہتے ہیں احتمال ہے کہ "چھوٹوں" سے مراد بے علم لوگ ہوں۔

وفی تفسیر ابن عباس وتفسیر سعید بن منصور "خلا عمر رضی الله عنه ذات یوم فجعل یحدث نفسه کیف تختلف هذه الامة ونبیها واحد ؟ فارسل الیٰ ابن عباس رضی الله عنه فقال کیف تختلف هذه الامة ونبیها واحد وقبلتها واحد قال فقال ابن عباس رض یا امیر المومنین انما انزل علینا القرآن فقراناه وعلمناه فیما انزل وانه سیکون بعدنا اقوام یقرؤن القرآن ولایدرون فیما نزل فیکون بهم فیه رأی فاذا کان

ابن عباس اور سعید ابن منصور کی تفسیروں میں مروی ہے کہ ایک دن حضرت عمر رض تنہائی میں تھے اور غور کر رہے تھے کہ اس امت میں کیسے اختلاف واقع ہو جائے گا جب کہ امت کے نبی ایک ہیں، پھر ابن عباس رض کو طلب کیا اور ان سے سوال کیا کہ اس امت میں کیسے اختلاف واقع ہو جائے گا جب کہ اس امت کے نبی ایک ہیں اور قبلہ بھی ایک ہی ہے، تو ابن عباس رض نے کہا، اے امیر المومنین بے شک قرآن ہمارے زمانے میں نازل ہوا اور ہم نے اسے پڑھا اور اس کے مواقع نزول کو سمجھا، ہمارے بعد کچھ لوگ آئیں گے اور وہ

---

[1] بحوالہ مشکوٰۃ کتاب العلم ص۳۵، [2] الاعتصام جلد ۳ ص۱۹۱۔

كذلك اختلفوا فاذا اختلفوا اقتتلوا [1]

قرآن پڑھیں گے لیکن اس کے مواقع نزول سے ناآشنا ہوں گے، قرآن میں خود اپنی ہی رائے پیش کریں گے، اور جب یہ صورت حال ہوگی تو اختلاف کریں گے اور جب اختلاف برپا ہوگا تو جدال وقتال تک کی نوبت آئے گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں :

ايضاً جهل روس الناس واستفتاء الناس من لاعلم له بالحديث ولا بطريق التخريج كما ترى ظاهرا فى اكثر المتاخرين ونبه عليه ابن همام وغيره وذلك الوقت سمى غير المجتهد فقيها [2]

اور نیز ایک سبب یہ بھی تھا کہ حکام جاہل تھے اور لوگ ایسے لوگوں سے فتویٰ لیتے تھے جن کو نہ علم حدیث حاصل تھا اور نہ وہ تخریج کے طریقہ سے واقف تھے جیسا کہ اکثر متاخرین کی ظاہری حالت تم دیکھتے ہو، ابن ھمام وغیرہ نے اس پر تنبیہ کی ہے اور اس زمانے میں غیر مجتہد کو بھی فقیہ کہنے لگے تھے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :

كتب سلمان رض الى ابى الدرداء رضى الله عنه وقد كان اخى بينهما رسول الله صلى الله عليه وسلم يا اخى بلغنى انك قعدت طبيبا تداوى المرضى فانظر فان كنت طبيبا فتكلم فان كلامك شفاء وان كنت متطببا فالله لا تقتل مسلما فكان ابو درداء

حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابو درداء کے پاس خط لکھا ان دونوں کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ قائم فرمایا تھا ...... اے میرے بھائی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ طبیب بن کر مریضوں کا علاج کرتے ہیں تو غور کر لیجئے اگر آپ واقعۃً طبیب ہوں تو گفتگو کیجئے آپ کا کلام باعث شفا

---

[1] الاعتصام جلد ۳ ص ۲۹-۳۰

[2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۳

یتوقف بعد ذالك اذ سئل [1]　　ہوگا اور اگر آپ واقعی طبیب نہ ہوں، تو خدارا کسی مسلمان کو ہلاکت میں نہ ڈال لئے ۔ اس کے بعد حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے جب بھی کوئی سوال کیا جاتا تو وہ توقف کرتے تھے ۔

اس عبارت سے مسائل علمیہ میں بصیرت کے بغیر رائے زنی کی سخت مذمت ثابت ہوئی، نیز اس سلسلہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے شدت احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔

قال بعض اهل العلم لا يؤتون الناس قط من قبل علماءهم وانما يؤتون من قبل انه اذا مات علماءهم افتى من ليس بعالم [2]

بعض اہل علم کا قول ہے کہ لوگوں پر افتاد علماء کی جانب سے کبھی بھی نہیں آتی لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا سبب محض یہ ہوتا ہے کہ علماء کے گذر جانے کے بعد جہلاء ہی منصب فتوی پر فائز ہوجاتے ہیں

اختلاف کا دوسرا سبب :

۲۔ اختلاف امت کا دوسرا اہم سبب اتباع ہوی ہے یعنی کتاب وسنت کی تصریحات کو پس پشت ڈال کر آدمی خواہشات نفسانیہ کی راہ اختیار کرلیتا ہے اور اسی کو اپنا حاکم اور مقتدا بنالیتا ہے ۔　　صاحب الاعتصام فرماتے ہیں :

والثاني من اسباب الاختلاف اتباع الهوى ولذلك سمى اهل البدع اهل الهواء لانهم اتبعوا اهواءهم فلم يأخذوا الادلة الشرعية مأخذ الافتقار اليها والتعول عليها حتى يصدروا عنها بل قدموا اهواءهم

اختلاف کا دوسرا سبب اتباع ھوی ہے اسی وجہ سے اہل بدع کو "اہل اھواء" کہتے ہیں کیوں کہ انہوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کی، اسی بناء پر ادلہ شرعیہ کو اپنے احتیاج کا مرکز نہیں قرار دیا، اور نہ ہی ان پر اعتماد کیا کہ ان کی طرف وہ میلان کرتے بلکہ اپنی خواہشات

---

[1] احیاء العلوم ص ۶۷ ج ۱ ، [2] الاعتصام ص ۱۵ جلد ۳ ۔

واعتمدوا علی آراءهم ثم جعلوا الادلة الشرعية منظوراً فيها من وراء ذالك [1]

کو مقدم رکھا اور اپنی رایوں ہی پر اعتماد کیا اور شریعت پر ان کی نظر ثانوی درجہ کی رہی۔

قرآن وحدیث اور آثار سلف میں اتباع ہوئی کو فساد و ضلال کی اصل قرار دیا گیا ہے

قال اللہ تعالیٰ :

هو الذی انزل علیك الكتاب منه آيات محكمات هن ام الكتاب واُخر متشابهات فاما الذين فی قلوبهم زيغ فيتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاويله (سورۂ آل عمران پ۳)

وہ اللہ جس نے آپ پر کتاب اتاری اس میں سے بعض آیات محکمات ہیں وہی اصل کتاب ہیں، اور بعض دوسری متشابہ آیات ہیں تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے، اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے۔

وقال اللہ تعالیٰ :

ومن اضل ممن اتبع هواه بغير هدیً من الله۔ (سورۂ قصص پ۲)

اور ایسے شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اپنی نفسانی خواہشات پر چلتا ہو بدون اسکے کہ منجانب اللہ کوئی دلیل ہو۔

وقال اللہ تعالیٰ :

ولا تتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله (سورہ صٓ پ۲۳)

خواہشات کی اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں گی۔

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم سيخرج فی امتی اقوام تتجاری بهم تلك الاهواء كما تتجاری الكلب بصاحبه

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں عنقریب ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جن میں یہ خواہشات ایسے سرایت کرجائیگی

حتی لا یبقی منه عرق ولا مفصل الا دخله [1]

جیسے داء الکلب کا مرض اپنے مریض کے اندر سرایت کر جاتا ہے کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہتا۔

وفی صحیح مسلم عن عائشة ان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان اذا قام من اللیل یصلی یقول اللّٰهم رب جبرئیل ومیکائیل فاطر السمٰوات والارض عالم الغیب والشهادہ انت تحکم بین عبادك فیما کانوا فیه یختلفون اهدنی لما اختلف فیه من الحق باذنك انك تهدی من تشاء الی صراط مستقیم فمن خرج عن الصراط المستقیم کان متبعا لظنه وما تهواہ نفسه ومن اضل ممن اتبع هواہ بغیر هدیً من اللّٰه [2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو فرماتے تھے، اے اللہ جبرئیل اور میکائیل کے رب، زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کھلی اور چھپی چیزوں کو جاننے والے آپ فیصلہ کریں گے اپنے بندوں کے درمیان ان چیزوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے، مجھے اپنے فضل سے اس حق کی ہدایت دیجئے جس میں اختلاف کیا گیا بے شک آپ جس کو چاہتے ہیں صراط مستقیم کی ہدایت دیتے ہیں، تو جو شخص صراط مستقیم سے نکل گیا وہ اپنے گمان اور نفسانی خواہشات کی اتباع کرنے والا ہے اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جس نے کسی منجانب اللہ دلیل کے بغیر اپنی خواہشات کی اتباع کی۔

عن ابن مسعود رض من احب ان یکرم دینه فلیعزل مخالطة الشیطان ومخالطة اصحاب الاهواء فان

ابن مسعودؓ سے مروی ہے جو شخص اپنے دین کو مکرم رکھنا چاہتا ہو، تو وہ شیطان اور اہل ہویٰ کی مخالطت سے احتراز کرے کیوں کہ

---

[1] الاعتصام ص $\frac{19}{ج ۲}$۔

[2] ابو داود احمد عن معاویہ رض بحوالہ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۳۱۔

مجالسهم الصق من الجرب [1]

ان کی ہم نشینی خارش سے بھی زیادہ آ لگنے والی ہے۔

ان رجلا سئل عن ابراهيم النخعي عن الاهوا ايها خير فقال ما جعل الله في شيء عن الهوىٰ مثقال ذرة من خير ما هي الا زينة الشيطان [2]

ابراہیم نخعیؒ سے ایک شخص نے "اھوا" کے بارے میں سوال کیا کہ ان میں کون بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کسی بھی "ھویٰ" میں اللہ تعالیٰ نے ذرہ بھر بھی خیر نہیں رکھی، یہ تو شیطان کی زینت ہے۔

قال الشعبي رح احذركم اهل هذه الاهواء المضلة [3]

شعبی رح نے فرمایا میں تم کو ان گمراہ کن خواہشات والوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ؛

ومنها الاغراض الفاسدة الحاملة على التاويل الباطل كطلب مرضاة الملوك في اتباعهم الهوىٰ لقوله تعالىٰ ان الذين يكتمون ما انزل الله من الكتاب ويشترون به ثمنا قليلا اولئك ما ياكلون في بطونهم الا النار [4]

فساد دین کے اسباب میں ایک سبب اغراضِ فاسدہ ہیں جن کی خاطر لوگ جھوٹی تاویلیں کرتے ہیں، جیسے بادشاہوں کی خوشنودی کی خاطر ان کی خواہش نفسانی پوری کرنے کیلئے لوگ ایسا کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں جو لوگ کتاب الٰہی کے احکام کو جو منزل من اللہ ہیں چھپاتے ہیں اور ان کے عوض کچھ قیمت لیتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ بھرتے ہیں

---

[1] الاعتصام جلد ۲ ص ۱۶۰ ،
[2] " ص ۲۶ ،
[3] منہاج السنہ جلد ۱ ص ۱۴ ،
[4] حجۃ اللہ البالغہ " ص ۲۸۲-۲۸۳ ۔

خلاصۂ بحث

خلاصہ بحث یہ ہے کہ عدم تقلید کی وجہ سے جو افتراق واختلاف امت کے اندر پیدا ہوتا ہے وہ اسی تیسری نوع کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور میں اسی کی خبر دی ہے اور اسی کی بنیاد پر امت مسلمہ مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، اور اس اختلاف کے اسباب بھی عموماً یہی دو ہیں:

اتباع ھویٰ

عدم علم وصلاحیت کے باوجود علم واجتہاد کا ادعاء۔ اللّٰھم احفظنا منہ۔

[انشاء اللہ آئندہ محاضرہ میں "تقلید کے ائمہ اربعہ میں انحصار" اور اسی ضمن میں دوسرے مباحث آئیں گے]

بابت سنہ ۱۴۱۵ھ

چوتھا محاضرۂ علمیہ

بر موضوع

رد غیر مقلدیت

: پیش کردہ :

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذاہبِ اربعہ کی تخصیص

اَلحمدُ لِلّٰہِ وَکفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبادِہِ الَّذِینَ اصطفٰی

تقلید معین کے وجوب کے ثابت ہو جانے کے بعد یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ تقلید، ائمۂ اربعہ، پر منحصر ہے۔ یعنی انھیں حضرات ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید ضروری ہے۔ امت کے تمام قابل قدر اور اسم ترین علمارِ کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ بعد کے ادوار میں بہت سے مصالح کی بنیاد پر ائمہ اربعہ کی تقلید سے خروج کرنا جائز نہیں رہا۔ یہ بات گزر چکی ہے کہ اجماعِ امت۔ اصولِ دین اور دلائلِ شریعت میں سے ہے۔ اس کی حجیت نصوص کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ اس موقع پر نہایت تفصیل کے ساتھ علمائے کرام کے اقوال اور وہ وجوہات ومصالح بیان کی جاتی ہیں جو اس اجماع کی داعی اور متقاضی ہوئیں۔

حضرت مولانا وجیہ الدین صاحب مدرسِ اول مدرسہ کلکتہ نے اپنی محققانہ تصنیف "نظام الاسلام"[1] میں اس مسئلہ پر بڑی قیمتی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس زمانہ میں بلکہ زمانۂ دراز سے سب عالموں نے جب خوب دریافت کیا کہ قرآن اور حدیث سے بالاستقلال حکم نکالنا نہیں ہو سکتا ہے کیوں کہ ہر حدیث کو ثابت کرنا اور

---

[1] کتاب مذکور پہلی دفعہ ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوئی یہ وہی دور ہے جبکہ مولوی عبدالحق صاحب بنارسیؒ وغیرہ نے تقلید ائمہ کے خلاف شورو غوغا برپا کر رکھا تھا۔ یہ کتاب بہت مدلل اور مسئلہ تقلید پر مکمل تشفی بخش ہے اس زمانے کے تمام علمائے اہلِ سنت نے اس کو پسند کیا اور اسکی تصدیق کی۔ تنبیہ الضالین میں ہے "نظام الاسلام کے چھپ جانے کے بعد اکثروں کو جن کو عقل تھی سوجھ آگئی اس بڑے اعتقاد سے انہوں نے توبہ کیا،، صـ

اس کے راویوں کے احوال دریافت کرنا اور صحیح اور حسن اور ضعیف اور غریب کی تحقیق کرنا
اور مجمل اور ماؤل اور ناسخ اور منسوخ کو تمیز دینا اور ہر ایک کی غرض اور مراد کو
پہنچنا بالاستقلال یعنی صرف اپنی تلاش اور جستجو سے حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ
آخر کو لاچار ہو کر پشیمان بن کر ان سب شرطوں کو حاصل کرنے کے لیے کسی محدث یا مجتہد
یا فقیہ کی تقلید کرنی پڑے گی تو ابتداء سے تقلید کسی مجتہد کی اپنے اوپر واجب کرنی ہے
اور اسی واسطے سب علماء نے اجماع کیا اس بات پر کہ جس مجتہد کے اجتہاد پر تمام علماء کا
اتفاق ہو اور سب فاضلوں کے نزدیک اس کا اجتہاد مقبول ہو اور مذہب اس کا
نقل تواتر سے منقول ہو اور مسائل اور قواعد اس کے مذہب کے بشبہہ مفصلاً مروی
ہوں تو ایسے کی تقلید درست ہے۔ پھر کوئی مجتہد ان اوصاف کے ساتھ سوائے
چار امام کے پایا نہیں گیا اور کوئی مذہب ان صفات کے ساتھ سوا ان چار مذہب
کے ثابت نہیں ہوا اس واسطے سب علماء اور تمامی فضلاء کا اجماع اس بات پر
ہوا کہ ان چار مذہب میں سے ایک مذہب کی پیروی کرنی واجب ہے اور ان کے
سوا کسی اور مجتہد کی تقلید یا دوسرے کسی طریقے کی پیروی جائز نہیں ہے اور
کوئی یہ گمان نہ کرے کہ صرف علماء حنفی نے یہ اجماع کیا ہے، بلکہ دوسرے
مذہب مختلف کے علماء نے بھی اسی بات پر اتفاق کیا ہے جیسا سابق جواب
میں سوال چوبیسویں[۲۴] کے بہت سی کتابوں سے مذکور ہوا ہے پھر ثانیاً تفصیل
کی حاجت نہیں ہے لیکن بطور نمونہ کے صرف ایک کتاب سے لکھا جاتا ہے۔
نہایۃ المراد شرح مقدمہ ابن عماد میں ہے۔

وفی زماننا قد انحصرت صحۃ التقلید فی ھذہ المذاھب
الاربعۃ فی الحکم المتفق علیہ بینہم وفی الحکم المختلف
فیہ ایضًا لا باعتبار ان مذاھب غیرھم من السلف باطلۃ
وانما لاعتبار ان مذاھبہم وصلت الینا بالنقل المتواتر
رواھا جماعۃ بعد جماعۃ فی کل ساعۃ من زمانہم الی

زماننا هٰذا لا یمکن عدّ الروایة ولا احصائهم فی اقطار الارض وبنیت لنا شروط مذاهبهم وفصلت مجملاتها وقیدت مطلقاتها بالنقل المتواتر بخلاف مذاهب غیرهم من السلف فانها نقلت الینا بطریق الاٰحاد فلو فرض ان حکما من احکام نقل عن بعض مذاهب السلف بطریق التواتر یحتمل ان یکون مجملا لم یفصله ناقله وان له قیدا اخل به ناقله اوشرطًا یتوقف علی القول بصحته عند ذالك المجتهد فیکون العمل به باطلا فلهٰذا الامر حصرنا صحة التقلید فی اتباع المذاهب الاربعة لاغیر

خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں تقلید منحصر ہے انھیں چار کے ایک مذہب میں اوران چار کے سوا اورکسی مجتہد کی تقلید درست نہیں ہے اس واسطے کہ ان چار اماموں کا مذہب نقلِ متواتر سے منقول ہوا ہے اوران کے زمانہ سے لے کر اس زمانے تک اس قدر راوی ان مذہب کے گزرے ہیں کہ شمار کرنا ان کا ممکن نہیں ہے اوران مذہبوں کی شرطیں اور تفصیل خوب بیان کی گئی ہیں بخلاف اور مذہبوں کے کہ تواتر سے مروی نہیں ہے ۔ اور تفصیل ان کی نہیں ہوئی ہے تو شاید کوئی کلام مجمل ہوکر اس کی تفصیل نہیں ہوئی ہو یا کوئی قید چھوٹ گئی ہو یا کوئی شرط کہ جس پر صحت اس قول کی موقوف ہو متروک ہوئی ہو تو ان صورتوں میں عمل اس پر باطل ہوگا ۔ اس واسطے انھیں چار مذہب میں تقلید منحصر ہوئی ہے ۔

اورشافعی علماء نے بھی ایسے ہی کہا ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر شافعیؒ نے فتح المبین فی شرح الاربعین کے اٹھائیسویں حدیث کی شرح میں لکھا ہے اما فی زماننا فقال ائمتنا لاتجوز تقلید غیرا لائمة الاربعة الشافعی ومالك وابی حنیفة واحمد رضوان اللّٰه علیهم اجمعین ۔ لان هٰؤلاء عرفت قواعد مذاهبهم واستقرت احکامها وخدمها تابعهم وحرروها فرعًا فرعًا وحکمًا

حکما فلا یوجد حکم الا وھو منصوص لھم اجمالا وتفصیلا بخلاف غیرھم فان مذاھبھم ان تحرروا لم تدون کذالک فلا تعرف لھا قواعد حتی تتخرج علیھا احکامھا فلم یجز تقلیدھم فی ما حفظ عنھم منھا لانہ قد یکون مشروطا بشروط اخری وکلوھا الی فروعھا من قواعدھم فقلت الثقۃ بجمیع ما یحفظ عنھم من قید وشرط فلم یجز التقلید حینئذٍ۔ خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ ہمارے اماموں نے یعنی شافعیوں نے کہا ہے کہ اس زمانے میں ان چار اماموں کے سوا اور کسی مجتہد کی تقلید جائز نہیں ہے۔ اس واسطے کہ ان چار اماموں کے مذہب اور ان کے قاعدے خوب معلوم و مشہور ہیں اور مسئلے ان کے خوب ثابت ہیں اور تابعیوں نے ان کے مذہب کو خوب ضبط کیا ہے اور بالتفصیل ہر ایک کو لکھا ہے بخلاف اور مجتہدوں کے کہ ان کا مذہب لکھا ہوا نہیں ہے اور قاعدہ ان کا معلوم نہیں اور تفصیل ان کے مذہب کی منقول نہیں اور مسائل ان کے مذہب کے ضبط نہیں اس واسطے دوسرے مذہب پر خوب اعتماد نہیں۔ اور مالکی علماء نے بھی ایسے ہی کہا ہے علامہ ابراہیم ابن مرعی سرخسی کہ مالکی المذہب اور فاضل اور محدث اور مالکیوں میں معتمد علیہ ہیں انھوں نے فتوحات الوھبیہ فی شرح الاربعین للنووی۔ کی اٹھائیسویں حدیث کی شرح میں لکھا ہے ماعرف عن ھٰؤلاء الصحابۃ الاربعۃ او عن بعضھم اولی باتباع من بقیۃ الصحابۃ اذا وقع بینھم الخلاف الی قولہ وھٰذا فی المقلد الصرف فی تلک الازمنۃ القریبۃ من زمن الصحابۃ اما فیما بعد ذالک فلا یجوز تقلید غیر الائمۃ الاربعۃ مالک وابی حنیفۃ والشافعی واحمد لان ھٰؤلاء عرفت قواعد مذاھبھم واستقرت احکامھا وخدمھا تابعوھم وحرروھا فرعًا وحکمًا حکمًا۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جو حکم شرع کا کہ ان چار خلیفوں سے یا بعض سے ان کی معلوم ہوا ہے تو وہ مقدم ہے دوسرے صحابی کے قول پر اور یہ بات اس زمانے کے مقلد کے حق میں تھی۔ لیکن اس زمانے کے بعد جائز نہیں ہے تقلید سوا ان چار اماموں کے یعنی مالک

ابو حنیفہ۔ شافعی۔ احمدؒ کیوں کہ ان کے مذہب کے قاعدے سب معروف ہیں اور مسائل ان کے خوب ثابت اور مشہور ہیں اور تابعوں نے ان کے خوب ضبط کیا ہے اور ہر ایک بات کو مفصّلاً لکھا ہے۔ اب حاصل اس سب کا یہ ٹھہرا کہ شریعت کے علماء اور ہر مذہب کے فضلاء کا اجماع اور اتفاق اسی بات پر ہو گیا ہے کہ اس زمانے میں تقلید ایک امام کی ان چار اماموں میں سے واجب ہے اور ان کے سوا اور کسی کی تقلید درست نہیں ہے اور کسی عوام کو بلکہ اس زمانے کے خواص کو بھی اپنے سمجھ کے موافق قرآن و حدیث پر عمل کرنا اور اپنی دریافت پر اعتماد کرکے مسئلہ نکالنا جائز نہیں۔ اور اگر کوئی فاضل یا کوئی درویش اس اجماع سے نکلا ہو یا اس نے اس اتفاق کے برخلاف کیا ہو یا اس کے مخالف کہا ہو تو اس شخص کا کچھ اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ اجماع کی حدیثوں کے رو سے پیروی کرنی اس کی واجب ہے اور وہ اس سے عبارت ہے کہ اکثر علماء دیندار اور فضلاء نیک کردار ایک بات پر اتفاق کریں پھر اگر کوئی شخص اگرچہ عالم بھی ہو اس اجماع میں شریک نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود برخلاف ہوا اور جماعت کا مخالف بنا جیسا کہ مشکاۃ کے باب الاعتصام میں ہے۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتبعوا السواد الاعظم فانہ من شذ شذ فی النار[1] یعنی پیروی کرو جماعت کی سو مقرر یوں ہے کہ جو جدا ہوا جماعت سے گر پڑا وہ جہنم میں۔

وعن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الشیطان ذئب الانسان کذئب الغنم یاخذ الشاذۃ والقاصیۃ والناحیۃ وعلیکم بالجماعۃ والعامۃ[2]۔ یعنی بشبہہ شیطان آدمی کے حق میں جیسا کہ بھیڑیا بکری کے حق میں ہے کہ پکڑتا ہے بکری اور دور پڑے اور کنارے کرے ہوئے کو تو واجب تم پر ہے کہ جماعت اور اکثر مسلمانوں کی پیروی کو لازم کرو۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۳۰

[2] مشکوٰۃ شریف ص ۳۱۔

وعن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فارق الجماعۃ شبرا فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ۔

یعنی جو کوئی جدا ہوا جماعت سے ایک بالشت کے اندازے تو بے شبہہ اس نے اسلام کا ڈورا اپنی گردن سے نکالا۔ غرض ان حدیثوں سے صاف ظاہر ہوا کہ اکثر مسلمان جس بات پر اتفاق کریں وہ واجب ہوتا ہے اور بعضے کا خلاف کرنا کچھ نہیں ہے بلکہ جو اکثر کا مخالف ہوا تو اس پر خوف ضلالت کا اور ڈر جہنم کا ہے۔ نعوذ باللہ منہما ومنہم، اور جو کوئی جماعت کی پیروی کرے گا تو وہ ہدایت پر رہے گا اور ضلالت سے بچے گا[1]

اس مفصل عبارت سے بطور اختصار یہ چند باتیں ثابت ہوئیں۔

۱:- یہ اجماع ہے کہ سارے علماء و فضلاء کے نزدیک جس مجتہد کا مذہب مقبول ہو۔ جس کے اصول و قواعد مفصل ہوں اور جو تواتر سے منقول ہو۔ اسی کی تقلید جائز ہے

۲:- یہ بات صرف ائمہ اربعہ ہی کو حاصل ہے۔

۳: تمام علماء فضلاء کا اجماع ہے کہ ان چار مذہبوں میں سے کسی ایک کی پیروی کرنی واجب ہے۔

۴: صرف علماء احناف ہی نہیں بلکہ تمام مسالک کے علماء کا اس پر اجماع ہے۔

۵: اگر کوئی شخص اس اجماع میں شریک نہ ہو تو اس کا کچھ اعتبار نہیں بلکہ وہ اجماع کا مخالف قرار دیا جائے گا۔ حضرات علماء حرمین شریفین نے بھی اپنے فتوٰی[3] میں انہیں حقائق کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] مشکوٰۃ شریف ص ۳۱

[2] انتظام الاسلام ص ۱۰۹ تا ۱۱۳

[3] مذکورہ فتوٰی کی نسبت تنبیہ الضالین میں لکھا ہے کہ:

"آخر اس مذہب نو کی کیفیت علمائے حرمین شریفین کی خدمت میں ظاہر کی انہوں نے ان کے طریقے کو مردود اور جھوٹے ہونے کا فتوٰی دیا" ص ۴۔

" والحاصل انه لاینبغی لعاقل ان یختار فی الدین طریقة الا ما ارتضاها السلف والخلف وتواترت روایته وحصل الاجماع فی کل عصر علی حقیة ذالک فلم یوجد متصف کذالک الا ما اجمع علیه العلماء من حقیة المذاهب الاربعة عصرا بعد عصر وتلقتهم الامة بالقبول واما مالم یُنقل متواترا ولم یجمع علی حقیة ولم تلقته الامة کلها بالقبول فلا یلتفت الیه ولا یعول علیه[1]۔

حاصل یہ ہے کہ کسی عاقل کے لیے یہ مناسب نہیں کہ دین میں کوئی طریقہ اختیار کرے بجز اس طریقہ کے جس کو علماء سلف اور خلف نے پسند کیا ہو جس کی روایت تواتر سے ہو جس کی حقیت پر ہر دور میں اجماع رہا ہو۔ اور ایسا کوئی مذہب نہیں پایا گیا۔ مگر یہی چار مذہب کہ سب علماء نے ان کی حقیت پر اجماع کیا اور تمام امت نے ان کو تلقی بالقبول سے نوازا۔ اور جو مذہب کے تواتر سے منقول نہیں اور علماء نے اس کی حقیت پر اجماع نہیں کیا اور سب مسلمانوں نے اس کو قبول نہیں کیا تو اس کی طرف التفات اور اس پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

علماء حرمین کا یہ فتویٰ اہم ہے کیوں کہ خود علمائے حرمین کی اہمیت ہر دور میں امت کے اندر مسلم رہی ہے۔ بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ باب قائم فرماتے ہیں۔

بَابُ ماذکر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وحض علی اتفاق اھل العلم وما اجمع علیه الحرمان مکة والمدینة[2]۔

اس چیز کا باب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا اور اہل علم کے اتفاق پر تلقین فرمائی اور علمائے حرمین کے اجماع کا باب۔

امام بخاریؒ کا یہ باب قائم کرنا اجماع اہل حرمین کی عظمت اور اہمیت کی بنیاد پر ہے۔

خود امام بخاری رح اور بعض علماء کے نزدیک اجماع اہل حرمین حجت ہے[3]

---

[1] نظام الاسلام ص ۵۱۔۵۲ [2] بخاری شریف ج ۲ ص ۱۰۸۹ [3] ملاحظہ ہو نصر المقلدین ص ۱۲۱

تقلید ائمہ کے منکر حضرات بھی علامہ ابن تیمیہؒ کے پایۂ علم و تحقیق کے حد درجہ معترف ہیں۔ علامہ موصوف کا ارشاد ہے:

ولیس فی الکتاب والسنہ فرق فی الائمۃ المجتھدین بین شخص وشخص، فمالک واللیث بن سعد والاوزاعی والثوری ھٰؤلاء ائمۃ فی زمانھم، وتقلید کل منھم کتقلید الاخر لایقول مسلم انہ یجوز تقلید ھٰذا دون ھٰذا، ولٰکن من منع من تقلید احد ھٰؤلاء فی زماننا فانما یمنعہ لاحد شیئین (احدھما) اعتقادہ انہ لم یبق من یعرف مذاھبھم وتقلید المیت فیہ خلاف مشھور، فمن منعہ قال ھٰؤلاء موتی. ومن سوغہ قال لابد ان یکون فی الاحیاء من یعرف قول المیت (والثانی) ان یقول الاجماع الیوم قد انعقد علی خلاف ھذا القول..... واما اذا کان القول الذی یقول بہ ھٰؤلاء الائمۃ اوغیرھم قد قال بہ بعض العلماء الباقیۃ مذاھبھم فلا ریب ان قولہ

کتاب و سنت کے اعتبار سے ائمہ مجتہدین کے درمیان کوئی فرق نہیں، پس امام مالک اور لیث ابن سعدؒ، امام اوزاعیؒ، اور سفیان ثوریؒ یہ سب حضرات اپنے اپنے زمانوں کے امام ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کی تقلید کا حکم وہی ہے جو دوسرے کی تقلید کا ہے، کوئی مسلمان یہ نہیں کہتا کہ اس کی تقلید تو جائز ہے اور اس کی جائز نہیں۔ لیکن جن حضرات نے ان میں سے کسی کی تقلید سے منع کیا ہے دو باتوں میں سے کسی بات کی بنا پر منع کیا ہے: ایک بات تو یہ ہے کہ ان کے خیال میں اب ایسے لوگ باقی نہیں رہے جو ان حضرات کے مذاہب سے پوری طرح واقف ہوں، اور فوت شدہ امام کی تقلید میں اختلاف مشہور ہی ہے، لہٰذا جو لوگ اسے منع کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ان حضرات کا انتقال ہو چکا اور جو حضرات فوت شدہ امام کی تقلید کو جائز مانتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ فوت شدہ امام کی تقلید اس وقت جائز ہے جبکہ زندہ علماء میں کوئی اس فوت شدہ امام کے مذہب کا علم رکھتا ہو، (اور چونکہ دوسرے ائمہ کے

مؤید بموافقة هؤلاء و یعتضد به۔

مذاہب کا علم رکھنے والا موجود نہیں، اس لیے ان کی تقلید بھی درست نہیں)
دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ (جن حضرات کے مذاہب باقی نہیں ان کے) قول کے خلاف اجماع منعقد ہو چکا ہے۔
لیکن اگر ان گزشتہ ائمہ کا کوئی قول ایسا ہو جو ان مجتہدین کے قول کے مطابق ہو جن کے مذاہب باقی ہیں تو بلاشبہ اول الذکر ائمہ کے قول کی ثانی الذکر علماء کے قول سے تائید ہو جائے گی، اور اس میں قوت آجائے گی

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "عقد الجید" میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے۔ جس کا عنوان ہے "باب تاکید الاخذ بهذه المذاهب الاربعة والتشديد في تركها والخروج عنها"

باب سوم: ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے کی تاکید اور ان کو چھوڑنے اور ان سے باہر نکلنے کی شدید ممانعت میں۔

اس باب میں شاہ صاحبؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف وجوہ سے یہ مبرہن کیا ہے کہ تمام مفاسد کا سد باب اور مکمل حزم و احتیاط اسی میں ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کی جائے فرماتے ہیں:

"اعلم ان في الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفي الاعراض عنها كلها مفسدة كبيرة ونحن نبين ذالك بوجوه، احدها ان الامة

جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور ان سب کے سب سے روگردانی میں بڑا فساد ہے اور ہم اس بات کو کئی وجہوں سے بیان کرتے ہیں، وجہ اول یہ ہے کہ امت نے

---

[1] الفتاوی الکبریٰ لابن تیمیہؒ ص ۴۴۶ ج ۲

اجمعت على ان يعتمدوا على السلف
فى معرفة الشريعة، فالتابعون
اعتمدوا فى ذالك على الصحابة
وتبع التابعين اعتمدوا على
التابعين وهٰكذا فى كل طبقة
اعتمد العلماء على من قبلهم
والعقل يدل على حسن ذالك
لان الشريعة لايعرف الا بالنقل
والاستنباط . والنقل لايستقيم
الا بان ياخذ كل طبقة عمّن
قبلها بالاتصال ولابُدّ فى
الاستنباط ان يعرف مذاهب
المتقدمين، لئلا يخرج من
اقوالهم فيخرق الاجماع
وليبنى عليها وليستعين
فى ذالك بمن سبقه لان جميع
الصناعات كالصرف والنحو
والطب والشعر، والحدادة
والنجارة والصياغة لم يتيسّر
لاحد الا بملازمة اهلها وغير
ذالك نادرٌ بعيد لم يقع وان
كان جائزاً فى العقل واذا
تعين الاعتماد على اقاويل

اس بات پر اجماع کیا ہے کہ شریعت کے
معلوم کرنے میں سلف پر اعتماد کریں مثلاً
تابعین نے اس بارے میں صحابہ پر اور تبع تابعین
نے تابعین پر اعتماد کیا، اور اسی طرح ہر طبقہ
میں علماء نے اپنے پہلے علماء پر اعتماد کیا، اور اس امر
کی خوبی پر عقل بھی دلالت کرتی ہے، کیونکہ
شریعت دو ہی باتوں سے معلوم ہوتی ہے
ایک نقل دوم استنباط، اور نقل اسی طرح
سے ٹھیک ہوتی ہے کہ ہر طبقہ اپنے پہلے
طبقہ سے پیہم لیتا چلا آئے، اور استنباط
میں ضروری ہے کہ مذہب پہلوں کے جانے
اس وجہ سے کہ ان کے اقوال سے باہر نہ ہو جائے
ورنہ اجماع کے خلاف ٹھہرے گا،" اور
اس وجہ سے کہ پہلوں کے مذاہب پر اپنا
قول مبنی کرے اور اس وجہ سے کہ استنباط میں
اپنے گزشتوں سے اعانت لے کیوں کہ سب
فنون مثل صرف اور نحو اور طب اور شعر
اور آہنگری اور بردوگری اور زرگری کے
کسی کو جب ہی میسر ہوتے ہیں کہ اس فن کے
ماہر کی خدمت گزاری کرے، اور دوسری
طرح آجانا کم اور بعید از قیاس ہے۔ کہ کبھی
ہوا نہیں اگرچہ عقل کے نزدیک اور طرح بھی
ممکن ہے اور جب اقوالِ سلف پر اعتماد کرنا

السلف فلابد من ان یکون
اقوالهم التی یعتمد علیها
مرویة بالاسناد الصحیح
او مدونة فی کتب مشهورة
وان یکون مخدومة بان یبین
الراجح من محتملاتها وتخص
عمومها فی بعض المواضع ویقید
مطلقها فی بعض المواضع ویجمع
المختلف فیها ویبین علل
احکامها والا لم یصح الاعتماد
علیها ولیس مذهب فی هذه
الازمنة المتاخرة بهذه الصفة
الا هذه المذاهب الاربعة
اللهم الا مذهب الامامیة
والزیدیة وهم اهل البدعة
لایجوز الاعتماد علی اقاویلهم

* * *

ثابت ہوا تو اب یہ ضروری ہے کہ ان کے
وہ اقوال جن پر اعتماد کیا جائے یا سندِ صحیح
سے روایت کیے گئے ہوں یا مشہور
کتابوں میں قلم بند ہوں۔ اور یہ بھی ضروری
ہے کہ ان اقوال پر بحث ہوئی ہو۔ ان میں سے
احتمالِ راجح کا بیان کر دیا جائے، اور عام
اقوال بعض مواضع میں مخصوص کیے جائیں
اور اقوالِ مطلق کو بعض موقعوں میں مقید کیا
جائے۔ اور جن اقوال میں اختلاف ہو۔
ان میں مطابقت کی جائے اور ان کے
احکام کی علتیں بیان کی جائیں۔ اور اگر یہ
باتیں ان اقوال میں مشرح نہ ہوں گی تو انپر
اعتماد درست نہ ہوگا، اور ان اخیر وقتوں میں
کوئی مذہب اس صفت کا سوائے ان چاروں
مذہبوں کے نہیں، مگر ہاں امامیہ اور زیدیہ
کا مذہب ہے، اور وہ فرقہ بدعت والے ہیں، ان کے
اقوال پر اعتماد کرنا درست نہیں۔

* *

وثانیا، قال رسول الله صلی الله
علیه وسلم اتبعوا السواد الاعظم
ولما اندرست المذاهب الحقة
الا هذه الاربعة کان اتباعها
اتباعا للسواد الاعظم والخروج

اور دوسری وجہ پابندیٔ مذہب کی یہ ہے کہ
رسولِ خدا نے فرمایا کہ پیروی کرو بڑے جتھے
کی اور چونکہ سچے مذہب سوائے ان چاروں
مذہبوں کے نیست ہوگئے تو انکی پیروی کرنے میں
بڑے انبوہ کی پیروی کرنی ہے اور ان سے

عنها خروجًا عن السواد الاعظم
وثالثها، ان الزمان لما طال
وبعد العهد وضيعت الامانات
لم يجز ان يعتمد على اقوال علماء
السوء من القضاة الجورة
والمفتيين التابعين لاهوائهم حتى
ينسبوا ما يقولون الى بعض من
اشتهر من السلف بالصدق
والديانة والامانة اما صريحًا
او دلالة وحفظ قوله ذالك
ولا على قول من لا ندري هل
جمع شروط الاجتهاد اولا فاذا
رأينا العلماء محققين في حفظ
مذاهب السلف عسى ان يصدقوا
في تخريجاتهم على اقوالهم
واستنباطهم من الكتاب والسنة
واما اذا لم نرى منهم ذالك فهيهات[1]

باہر نکلنا بڑے جتھے سے باہر ہونا ہے۔
اور تیسری وجہ پابندی مذہب کی یہ ہے کہ جب عمدہ زمانہ گزرے بہت دن ہو گئے اور عرصہ بعید پڑ گیا اور امانتیں تلف کر دی گئیں تو اب اعتماد نہیں ہو سکتا علماء بد یعنے ظالم قاضیوں اور ہوا پرست مفتیوں کے اقوال پر جن کی شرارت یہاں تک ہے اپنے قول کو سلف کے ایسے شخص کی طرف بصراحت یا بدلالت منسوب کرتے ہیں جو صدق اور دیانت اور امانت میں مشہور اور اس کا وہ قول زبانوں پر مذکور ہوا اور نہ اس شخص کے قول پر اعتماد ہو سکتا ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ آیا شرطیں اجتہاد کی رکھتا ہے یا نہیں۔ پس جب ہم علماء کو دیکھیں کہ سلف کے مذاہب میں ثابت قدم ہیں تو غالب ہے کہ وہ مسائل جو یہ علماء سلف کے اقوال کے بموجب نکالیں یا خود کتاب و سنت سے استنباط کریں، اس میں علماء مذکور راست جانے جائیں گے اور جب ہم علماء میں یہ بات نہ دیکھیں تو ان کے اقوال کو راست جاننا بعید ہے۔

❊ ❊ ❊
❊ ❊
❊

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان بلند پایہ تحقیقات کا حاصل یہ ہے کہ:
(۱) شریعت پر چلنے کے لیے اسلاف پر اعتماد ضروری ہے کیوں کہ شریعت حقہ کا دارومدار

---

[1] عقد الجید ص ۳۱ - ۳۲ - ۳۳۰

نقل پر ہے۔ متقدمین سے ثابت شدہ قول کے خلاف کسی رائے پر عمل کرنا خلاف اجماع ہے
اسلاف کرام پر اعتماد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اقوال یا تو سندِ صحیح کے ساتھ مروی
ہوں یا کتبِ مشہورہ میں مدوّن ہوں۔ نیز ان کے اقوال پر ضروری کام ہو چکا ہو۔ یعنی ان کے
اقوال میں مختلف معانی کے محتمل قول کے راجح پہلو کی وضاحت، نیز وہ قول بظاہر عام یا مطلق ہو
لیکن درحقیقت اس میں کوئی تخصیص یا قید ملحوظ ہو تو اس کی تحقیق ان کے متضاد اقوال کے درمیان
تطبیق احکام کی علتوں کی تبیین۔ اس طرح کی ضروری چیزوں پر اس مذہب کے مزاج شناس
علماء نے اچھی طرح کام کر دیا ہو۔ یہ تمام صفات ائمۂ اربعہ کے علاوہ کسی بھی مجتہد کے مذہب
میں نہیں پائی جاتیں۔

(۲) حضورؐ کا ارشادِ مبارک ہے "اتّبعوا السواد الاعظم"۔ مذہبِ اربعہ کے علاوہ کوئی
بھی مذہب قابلِ عمل شکل میں باقی نہیں رہ گیا تو اب سوادِ اعظم انہیں مذاہب اربعہ میں منحصر ہوگیا

(۳) خواہش کے پیرو علمائے سو اپنی خواہش کے مطابق کوئی رائے ایجاد کر کے علمائے متقدمین
میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیں گے۔ اس فتنے کا سدِ باب یہی ہے کہ صرف انہیں علماء کے
قول پر فتویٰ کی اجازت دی جائے، جن کے اقوال کی توضیح و تشریح کی ضروری خدمت کی جا چکی
ہے تاکہ ان کی طرف کسی غلط بات کے انتساب کا خدشہ نہ رہ جائے۔ اور یہ ضروری خدمت
صرف مذاہب اربعہ کی ہو سکی ہے۔

بے شمار علمائے کرام نے اپنی تصانیف میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اس
موقع پر ہم مزید چند اہم اور قابلِ قدر علمائے امت کی تصریحات پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسئلہ کا
ہر گوشہ مختلف انداز میں نکھر کر سامنے آسکے۔

علامہ سید السمہودی الشافعیؒ العقد الفرید میں فرماتے ہیں:

نقل امام الحرمین عن المحققین
امتناع تقلید العوام للصحابة
رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین
وان کانوا اجل قدرًا لارتفاع

ترجمہ: امام الحرمین نے محققین سے نقل
کیا ہے کہ عوام کو صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ
علیہم اجمعین کی تقلید جائز نہیں اگرچہ ان کا
رتبہ بہت بڑا ہے۔ کیوں کہ ان کے مذہب

الثقة بمذاهبهم اذلم تدوّن ولم تحرّر بخلاف مذاهب الائمّة الذين لهم اتباعٌ وهٰذا احد قولين حكاهما ابن السبكى فى جمع الجوامع من غير ترجيح وبه جزم ابن الصّلاح وزاد انّه لانه لايقلد التابعين ايضًا ولا غيرهم ممن لم يدون مذهبهٗ وان التقليد متعين للائمّة الاربعة دون غيرهم لان مذاهبهم انتشرت حتّٰى ظهر تقييد مطلقها وتخصيص عامها بخلاف غيرهم ففيه فتاوىٰ مجردة لعل لها مكملا او مقيدا لوانبسط كلامه فيها لظهر خلاف مايبدو ومنه فامتناع التقليد اذًا لتعذر الوقوف على حقيقة مذاهبهم، والثانى جواز تقليدهم كسائر المجتهدين قال ابن السبكى وهو الصحيح عندى غير انى اقول لاخلاف فى الحقيقة بل ان تحقق مذهب لهم جاز وفاقًا والافلا قلت وان تحقق ذالك فالمنع يتفرع على ايجاب

مدوّن اور مرتب نہیں ہوسکے اس لیے ان پر اعتماد نہیں رہ گیا۔ بخلاف ائمہ اربعہ جن کے متبعین بے شمار ہیں۔ یہ ان دو قولوں میں سے ایک ہے جس کو علامہ ابن سبکیؒ نے جمع الجوامع میں بلا کسی ترجیح کے نقل کیا ہے اور ابن صلاحؒ نے اس کو قطعی قرار دیا ہے اور یہ مزید لکھا ہے کہ تابعین وغیرہ کی بھی تقلید جائز نہیں جن کے مذاہب مدوّن نہیں ہوسکے اور بے شک تقلید صرف ائمۂ اربعہ کی متعین ہے کیونکہ انہیں حضرات کے مذاہب پھیلے اور انہیں کے مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کی گئی۔ بخلاف دوسرے حضرات کے ہاں صرف فتاوے ہیں جنہیں احتمال ہے کہ مکملات و مقیدات ہوں۔ اگر فتاویٰ میں ان کے کلام کی تفصیل کی جائے تو ممکن ہے کہ ظاہر عبارت کے خلاف صورتحال ہو تو ان کے تقلید کا ناجائز ہونا محض انکے مذاہب کی اصل حقیقت کی واقفیت محال ہونے کی بنا پر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی تقلید جائز ہے جیسا کہ دوسرے مجتہدین کی تقلید جائز ہے۔ ابن سبکیؒ نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ ان مذاہب کے حق ہونے میں کوئی اختلاف

المتمذهب بمذهب معين في جميع المسائل ومنع الانتقال عنه اذ لا يعمّ مذهب الصحابي كل المسائل. وقال محقق الحنفيه الكمال ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ نقل الامام اي الفخر الرازيؒ اجماع المحققين على منع العوام من تقليد اعيان الصحابة بل يقلدون من بعدهم الذين سبروا ووضعوا ودوّنوا وعلىٰ هٰذا ما ذكر بعض المتاخرين من منع تقليد غير الاربعة لانضباط مذاهبهم. وتقييد مسائلهم وتخصيص عمومها ولم يدر مثله في غيرهم لانقراض اتباعهم وهو صحيح[1]

نہیں ہے۔ بلکہ صحابہ کرام رضؓ میں سے کسی کے مذہب کی تحقیق ہو جائے تو اس کی تقلید بالاتفاق جائز ہے ورنہ نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر مذہب صحابی کی تحقیق ہو جائے تو تقلید کا عدم جواز تمام مسائل میں مذہب معین کی تقلید کے ضروری ہونے اور اس سے انتقال کے ناجائز ہونے کی وجہ سے ہوگا کیوں کہ ایک صحابی کا مذہب تمام مسائل کو محیط نہیں ہوسکتا۔ احناف کے محقق الکمال ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام رازیؒ تحریر فرمایا ہے کہ محققین کا اجماع ہے کہ عوام کے لیے صحابہ کرام رضؓ کی تقلید جائز نہیں بلکہ بعد کے ان لوگوں کی تقلید کریں جن لوگوں نے تحقیق وتدوین کی اور مسائل کو ان کے محل میں رکھا۔ اسی بنا پر بعض متأخرین نے ائمۂ اربعہ کے علاوہ کی تقلید کا عدم جواز نقل کیا کیونکہ ان کے مذاہب منضبط ہیں۔ ان کے مسائل کی تقیید اور عمومات کی تخصیص ہوچکی اور یہ بات دوسرے حضرات کے سلسلہ میں نہیں کیوں کہ ان کے متبعین ہی نہیں رہ گئے یہی بات صحیح ہے۔

---

[1] العقد الفريد بحواله انتصار الحق. ص ۹۱-۹۲۔

اسی بات کو علامہ نوویؒ ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں:

ولیس له التمذهب بمذهب احد من ائمة الصحابة رضی الله عنهم وغیرهم من الاولین وان کانوا اعلم واعلیٰ درجة ممن بعدهم، لانهم لم یتفرغوا لتدوین العلم وضبط اصوله وفروعه فلیس لاحد منهم مذهب مهذب محرر مقرر وانما قام بذلك من جاء بعدهم من الائمة الناحلین لمذاهب الصحابة والتابعین القائمین بتمهید احکام الوقائع قبل وقوعها الناهضین. بایضاح اصولها وفروعها کمالكؒ وابی حنیفة.

صحابۂ کرامؓ اور قرونِ اولیٰ کے اکابر اگرچہ درجہ کے اعتبار سے بعد کے فقہاء مجتہدین سے بلند و برتر ہیں، لیکن انہیں اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنے علم اور اس کے اصول و فروع کو مدوّن اور منضبط کر سکتے، اس لیے کسی شخص کے لیے ان کے فقہی مذہب کی تقلید جائز نہیں، کیونکہ ان میں سے کسی کا مذہب مدوّن نہیں ہو سکا، نہ وہ لکھی ہوئی شکل میں موجود ہے اور نہ معین طور سے اس کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، دراصل تدوینِ فقہ کا یہ کام بعد کے ائمہ نے کیا ہے، جو خود صحابہؓ و تابعین کے مذاہب کے خوشہ چیں تھے اور جنھوں نے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی ان کے احکام مدوّن کیے اور اپنے مذاہب کے اصول و فروع کو واضح کیا مثلاً امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ۔

☆ ☆ ☆

علامہ نوویؒ اور علامہ سمہودیؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تمام تر عظمتوں اور رفعتوں کے باوجود ان کی تقلید کرنے کا راز یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے مذاہب کی تدوین و تہذیب کے مواقع نہ مل سکے اور نہ ان کے بعد والے ان کے سلسلہ میں یہ کام کر سکے۔ اور اگر ان حضرات کے اقوال ملتے بھی ہیں تو ان میں سے کسی ایک کے بھی اتنے اقوال نہیں ملتے جو تمام یا اکثر مسائل کو حاوی ہوں اس لیے ان میں سے کسی کی بھی مکمل تقلید ممکن نہیں لامحالہ بہت سے مسائل میں دوسروں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔اھ

یہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف منتقل ہونا ہے جو جائز نہیں رہا۔ اس کے برخلاف ائمہ اربعہ کے اصول و فروع منضبط اور محفوظ ہیں جن سے پیش آمدہ تمام مسائل میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور پھر ان حضرات نے صحابہ کرامؓ کے تمام اقوال کو اپنے مذاہب میں سمیٹ بھی لیا ہے۔

بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلیؒ شرح مسلم الثبوت میں فرماتے ہیں:

بل یجب علیھم اتباع الذین سبروا ای تعمقوا و بوبوا ای اوردوا ابوابا لکل مسئلۃ علی حدۃ فھذبوا مسئلۃ کل باب و نقحوا کل مسئلۃ عن غیرھا وجمعوا بینھما بجامع وفرقوا بفارقٍ وعللوا ای اوردوا لکلّ مسئلۃ علتہ وفصلوا تفصیلا وعلیہ بنا ابن الصّلاح منع التقلید غیر الائمۃ الاربعۃ الامام الھمام امامنا الائمۃ امامنا الکوفیؒ والامام مالکؒ والامام الشافعیؒ والامام احمد رحمھم اللہ تعالیٰ وجزاھم عنا احسن الجزاء لان ذالک المذکور لم یدر فی غیرھم[1]

ترجمہ: بلکہ ان عوام پر ان حضرات کی تقلید واجب ہے جنہوں نے نظر عمیق سے کام لیا اور ابواب قائم کرکے ہر مسئلہ کو اس کے مناسب باب میں ذکر کیا اور ہر مسئلہ کی تنقیح اور چھان بین کی اور جمع کیا اور تفریق کی اور ہر مسئلہ کی علت بیان کی اور پوری پوری تفصیل بیان کی اسی بناء پر ابن صلاحؒ نے ائمہ اربعہؒ کے سوا دوسروں کی تقلید سے ممانعت فرمائی ہے کہ امورِ مذکورہ مذاہب اربعہ کے علاوہ کسی اور مذہب میں موجود نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان ائمہ کو ہم سب کی طرف سے بہترین جزا عنایت فرمائے۔

⁂ ⁂ ⁂

علامہ شیخ احمد المعروف بہ مُلّا جیون صاحبؒ تفسیراتِ احمدیہ میں فرماتے ہیں:

---

[1] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ۶۲۹۔

قد وقع الاجماع علیٰ ان الاتباع انما یجوز للاربع وکذا لا یجوز الاتباع لمن حدث مجتهداً مخالفاً لهم[1]

اس پر اجماع ہو گیا ہے کہ اتباع صرف ائمۂ اربع ہی کی جائز ہے .... ان حضرات کے بعد میں پیدا ہونے والے ان کے مسلک کے مخالف مجتہد کی تقلید درست نہیں۔

چند سطور کے بعد مسئلۂ مذکورہ کی مزید توضیح وتشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والانصاف ان انحصار المذاهب فی الاربعة واتباعهم فضلٌ الٰهیٌّ وقبولیة من عند الله لا مجال فیه للتوجیهات والادلة[2]

یعنی انصاف کی بات یہ ہے کہ مذاہب کا چار میں منحصر ہو جانا اور ان ہی چار مذاہب کی اتباع کرنا فضلِ الٰہی اور منجانب اللہ قبولیت ہے اس میں دلائل اور توجیہات کی حاجت نہیں ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی جنھیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح "بیہقی وقت" کے لقب سے یاد کرتے تھے اپنی مایۂ ناز تفسیر "تفسیر مظہری" کے اندر فرماتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کی تقلید پر اہلِ سنت والجماعت کا انحصار ہو گیا ہے۔ قرنِ ثالث یا رابع کے بعد ان کی مخالفت کے بطلان پر اجماع مرکب منعقد ہو چکا ہے۔

قاضی صاحب کے الفاظ ہیں:

فان اهل السنة والجماعة قد افترق بعد القرن الثالثة او الاربعة علی اربعة المذاهب ولم یبق فی فروع المسائل سوٰی هٰذه المذاهب الاربعة فقد انعقد الاجماع المرکب علی بطلان

تیسری یا چوتھی صدی کے بعد اہلِ سنت والجماعت کے چار مذاہب رہ گئے ہیں مسائلِ فرعیہ میں ان کے سوا کوئی اور مذہب باقی نہیں رہا تو اجماع مرکب منعقد ہو گیا کہ جو قول ان چاروں میں ہر ایک کے مخالف ہو وہ باطل ہے۔

---

[1] تفسیرات احمدیہ ص ۳۴۶ [2] ایضاً ۳۴۶۔

قول من یخالفہ کلھم وقد قال اللہ تعالیٰ ومن یتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیراً[1]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ جو شخص مومنین کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ کو اختیار کرلے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شرح سفر السعادت میں تحریر فرماتے ہیں:

خانہ دین چہار است ہر کہ راہ از یں راہ ہائے و درے از یں درہائے اختیار نمودہ براہے دیگر رفتن و درے دیگر زفتن عبث و بیہودہ باشد و کارخانۂ عمل را از ضبط و ربط بیروں افگندن و از راہ مصلحت بیرون افتادن است[2]

یعنی دین کے گھر چار ہیں جس شخص نے کوئی راہ ان راہوں میں سے اور کوئی دروازہ ان دروازوں میں سے اختیار کیا۔ تو اس کا دوسری راہ اور دوسرا دروازہ اختیار کرنا بیہودہ اور عبث ہے اور کارخانۂ عمل کو مضبوطی اور استقامت سے دور کرنا ہے اور ... مصلحت سے باہر جانا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

⁂ ⁂

سید احمد طحطاویؒ فرماتے ہیں،

فعلیکم یا معشر المومنین باتباع الفرقۃ الناجیۃ المسماۃ باھل السنۃ والجماعۃ فانّ نصرۃ اللہ فی موافقتھم وخذلانہ وسخطہ ومقتہ فی مخالفتھم وھذہ الطائفۃ الناجیۃ قد اجتمعت الیوم

یعنی اے گروہ مسلمانان! تم پر نجات پانے والے فرقہ کی جو اہلِ سنت والجماعت کے نام سے موسوم ہے پیروی کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ موافقت کرنے میں ہے اور اہلِ سنت والجماعت کی مخالفت کرنے میں اپنی ذات کو خدا تعالیٰ کے غضب

---

[1] تفسیر مظہری ص ۲۴۳ [2] شرح سفر السعادت ص ۲۱۔

فی المذاھب الاربعۃ ھم الحنفیون والمالکیون والشافعیون والحنبلیون ومن کان خارجاً من ھذہ الاربعۃ فی ذالک الزمان فھو اھل البدعۃ والنار[1]

اور ناراضگی کا مورد بنانا ہے (اللہ اپنی پناہ میں رکھے) اور یہ نجات پانے والا گروہ (یعنی اہل سنت والجماعت) آج مجتمع ہوگیا ہے۔ چار مذاہب ہیں۔ اور وہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں اور جو شخص اس زمانہ میں چار مذاہب سے خارج ہے وہ اہلِ بدعت اور اہلِ نار سے ہے (اہلِ سنت والجماعت میں داخل نہیں)

امت کے مایۂ ناز فقہاء و محدثین مثلاً (۱) علامہ نوویؒ شارح مسلم متوفی ۶۷۵ھ (۲) علامہ ابن تیمیہؒ متوفی ۷۲۸ھ (۳) امام ابراہیم سرخسی مالکیؒ (۴) علامہ سمہودی شافعیؒ (۵) محدث ابن حجر مکی شافعیؒ متوفی ۸۵۲ھ (۶) علامہ ابن الہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ (۷) شاہ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۲۵ھ (۸) شیخ احمد المعروف بملاجیونؒ صاحب تفسیر احمدی متوفی ۱۱۳۰ھ (۹) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ (۱۰) علامہ بحر العلوم عبد العلی فرنگی محلیؒ متوفی ۱۲۳۵ھ (۱۱) قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب تفسیر مظہری متوفی ۱۲۲۵ھ۔ (۱۲) علامہ سید احمد طحطاوی متوفی ۱۲۳۲ھ وغیرہ کی ان تصریحات و تحقیقات سے یہ بات محقق اور مدلل ہو چکی کہ ائمۂ اربعہ ہی کی تقلید پر انحصار کے سلسلہ میں پوری امت کا اجماع ہو چکا ہے لیکن بعض ذہنوں میں اس سلسلہ میں اعتراضات و شبہات ہیں۔ حق طلب حضرات کی تشفی و تسلی کے لیے آئندہ سطور میں ان اعتراضات کے جوابات عرض کیے جاتے ہیں۔

تقلیدِ ائمۂ اربعہ کی تخصیص پر پہلا شبہ مشہور غیر عالم جناب مولانا نذیر حسین صاحب دہلویؒ نے اپنی کتاب معیار الحق میں شرح مسلم الثبوت سے علامہ قرافی مالکیؒ کا یہ قول نقل

[1] طحطاوی علی الدر المختار۔ ص ۱۵۳ ج ۴

کیا ہے:

قال القرافی العقد الاجماع علیٰ ان من اسلم فلہ ان یقلد من شاء من العلماء من غیر حجر واجمع الصحابة علی ان من استفتیٰ ابابکر وعمر امیری المومنین فلہٗ ان یستفتی اباهریرة ومعاذ بن جبل وغیرهما ویعمل بقولهم من غیر نکیر فمن ادّعیٰ برفع هٰذین الاجماعین فعلیه البیان	ترجمہ: قرافیؒ نے لکھا ہے کہ اس بات پر اجماع منعقد ہوا ہے کہ جو مسلمان ہو جائے اس کے لیے جائز ہے کہ بلا کسی رکاوٹ کے جس عالم کی چاہے تقلید کرے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے کہ جو شخص امیر المومنین حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مسئلہ پوچھے اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ ابو ہریرہ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بھی مسائل دریافت کرے جو شخص ان دونوں اجماع کے خلاف دعویٰ کرے اس کے ذمے دلیل پیش کرنی ہے۔

یہ عبارت نقل کرکے صاحب معیار الحق تحریر فرماتے ہیں:

"معلوم ہوا کہ منع کرنا ابن صلاح کا تقلید سے غیر ائمہ اربعہ کی اجماع مرکب پر مبنی نہیں بلکہ قول پر امام الحرمین کے اور وہ پھر بھی غلط اور مخالف اجماع صحابہؓ اور اجماع تمام مسلمین کے ہے۔"[1]

علامہ قرافی مالکیؒ نے اپنے کلام میں دو اجماع کا دعویٰ کیا ہے ایک تو یہ کہ ہر مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ جس مجتہد کی چاہے تقلید کرے دوسرا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ اجماع نقل کیا ہے ـــــــ کہ جو شخص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مسئلہ معلوم کرتا ہو اسے یہ بھی حق ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے مسئلہ معلوم کرے اور ان کے قول پر عمل کرے۔

شبہ مذکورہ کا جواب | اس سلسلہ میں عرض ہے کہ علامہ قرافیؒ کا نقل کردہ پہلا

[1] معیار الحق ص ۴۴

اجماع۔ اکثر ثقات و محققین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ یہ مسئلہ علمائے کرام کے درمیان ہمیشہ اختلافی رہا ہے کہ اگر چند اصحابِ اجتہاد موجود ہوں تو قاصدِ تقلید کو اختیار ہے کہ وہ جس کی چاہے تقلید کرے خواہ وہ مفضول ہی ہو یا ان سب میں افضل کی تقلید ضروری ہے۔ یہ دو نقطۂ نظر ہیں دونوں ہی کے قائلین میں علمائے کرام کا ایک معتد بہ گروہ شامل ہے۔

علامہ سید سمہودیؒ اس مسئلہ پر مفصّل بحث کرتے ہوئے مختلف علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں:

اذا تعدد من یصلح للتقلید فهل یلزم مریدہٗ ان یجتهد فیسأل اعلمهم وجهان قال ابن شریح نعم واختارہٗ ابن کج والقفال لانهٗ یسهل علیه هذا القدر من الاجتهاد واصحُّهما عند الجمهور انه یتخیر فیسأل من شاء لان الاولین کانوا یسألون علماء الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم مع تفاوتهم فی العلم والفضل ویعملون بقول من شاؤا من غیر نکیرٍ وقال الغزالی وان اعتقد احدهم اعلم لم یجز ان یقلد غیرہٗ وان کان لا یلزمه البحث عن الاعلم اذا لم یعلم اختصاص احدهم بزیادة علم قال

ترجمہ: جب صلاحیت اجتہاد رکھنے والے متعدد حضرات موجود ہوں تو کیا طالبِ تقلید کے لیے لازم ہے کہ معلوم کرکے سب میں اعلم کی تقلید کرے؟ اس سلسلہ میں دو نظریے ہیں۔ ابن شریح فرماتے ہیں۔ ہاں یہی لازم ہے اسی کو ابن کجؒ اور قفالؒ نے بھی اختیار کیا ہے کیوں کہ طالبِ تقلید کے لیے اعلم کی تحقیق چنداں دشوار نہیں ہے لیکن جمہور کے نزدیک صحیح نظریہ یہ ہے کہ طالب کو اختیار ہے کہ وہ جس کی چاہے تقلید کرے کیوں کہ پہلے حضرات علماء صحابۂ کرامؓ سے دریافت کیا کرتے تھے اور بلا کسی نکیر کے جس کے قول پر چاہتے تھے عمل کرتے تھے۔ حالانکہ حضراتِ صحابہؓ میں باہم علم و فضل کے اعتبار سے تفاوت تھا۔ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے

فی زوائد الروضة هذا الذی
قال الغزالی قد قال غیره ایضاً
وهو ان کان ظاهراً ففیه
نظر لما ذکرنا من سوال آحاد
الصحابة رضی الله تعالیٰ
عنهم مع وجود افاضلهم الذین
فضلهم متواتر وقد یمنع هذا
وعلی الجملة المختار ما ذکره
الغزالی فعلی هذا یلزمه تقلید
اورع العالمین واعلم الورعین
وان تعارضا قدم الاعلم علی
الاصح انتهی وقال العلی القاری
فی رسالة المصنفة فی بیان جواز
الاقتداء بالمخالف من اسلم
او تاب عن المعاصی والتزم احکام
الشرع فله ان یختار من المذاهب
ای مذهب شاء اذا تعدد
المجتهدون فی البلد علی قول
من جوز تقلید المفضول مع وجود
الافضل واما علی قول من عین
تقلید الفاضل وهو الاحوط
فعلیه ان یبحث ویتبع الفاضل[1]

اگر آدمی کسی کو اعلم سمجھتا ہے تو اس کے لیے
جائز نہیں ہے کہ اس کے غیر کی تقلید کرے
اگرچہ اس کے ذمہ اعلم ہونے کی تحقیق
ضروری نہیں ہے جب کہ وہ کسی کے زیادتیٔ
علم سے اختصاص کی پرکھ نہ رکھتا ہو۔
زوائد الروضہ میں لکھا ہے کہ یہ جو غزالیؒ نے
کہا ہے۔ اسی کو بعض دوسرے لوگوں نے بھی
کہا ہے۔ یہ بات اگرچہ ظاہر ہے۔ لیکن
اس میں کچھ خلجان ہے۔ جیسا کہ ہم نے
ذکر کیا ہے کہ مختلف حضرات صحابۂ کرامؓ
سے سوالات کیے جاتے تھے حالاں کہ
ان کے وہ افاضل بھی موجود تھے جن کا
فضل متواتر ہے۔ لیکن یہ چیز بعض دفعہ
ممنوع ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام مختار وہی ہے
جس کو غزالیؒ نے ذکر کیا۔ تو اس صورت میں
آدمی علماء میں سب سے پرہیزگار اور متقیوں میں
سب سے اعلم کی تقلید لازم ہوگی اور اگر اورع
اور اعلم میں تعارض ہو تو اصح یہ ہے کہ اعلم
ہی قابلِ ترجیح ہوگا۔ ملّا علی قاریؒ نے
مخالف کی اقتداء کے جواز کے سلسلہ میں
اپنے رسالہ کے اندر لکھا ہے کہ جو شخص مسلمان
ہوا یا معاصی سے تائب ہو کر احکامِ شرع کا

---

[1] العقد الفرید بحوالہ انتصار الحق ص ۹۲-۹۳۔

متبع بن گیا۔ اس کے لیے اس قول کی بنا پر
کہ "افضل کی موجودگی میں مفضول کی تقلید
درست ہے" یہ جائز ہوگا کہ شہر کے
مختلف مجتہدین میں سے جس کی چاہے
تقلید کرے۔ لیکن ان حضرات کے قول کے
اعتبار سے جو افضل ہی کی تقلید ضروری
قرار دیتے ہیں اور یہی احوط بھی ہے۔
عمل کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ
افضل ہی کی تحقیق و تلاش کرے۔

الحاصل اس قدر علمائے کرام کی مخالفت کے باوجود مسئلہ زیر بحث پر علامہ قرانی رح کے لیے "اجماع" کا دعویٰ کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

علامہ قرانی رح نے جو دوسرا دعویٰ کیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں یہ اجماع ہو چکا ہے کہ جو شخص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے فتویٰ پوچھے تو اس کے لیے جائز ہے کہ اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے بھی مسائل پوچھ سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں صحابۂ کرامؓ کا اجماع قولی تو کوئی منقول اور ثابت نہیں۔ ہاں محض سکوت اور عدم انکار کی بنیاد پر اجماع سکوتی کا دعویٰ کیا جائے تو یہ بھی محل نظر ہے کیوں کہ جب تک رضامندی اور تحسین کے قرائن نہ پائے جائیں محض سکوت سے اجماع منعقد نہیں ہوتا کیوں کہ اس بات کا مکمل امکان ہے کہ سکوت بعض دیگر مصالح کی بنیاد پر ہو جیسا کہ صاحب تلویح فرماتے ہیں:

وقد يكون سكوت المجتهد للتأمل وغيره كاعتقاد حقية كل مجتهد او كون القائل اكبر سنا او اعظم

ترجمہ: کبھی مجتہد کا سکوت اختیار کرنا تامل یا کسی اور بنا پر ہوتا ہے مثلاً ہر مجتہد کے حق ہونے کا اعتقاد یا کہنے والے کا عمر

قدر او وفرعلما او استقرار الخلاف حتی لو حضر مجتهد الحنفية والشافعية وتكلم احدهم بما يوافق مذهبه وسكت الآخرون لم يكن اجماعًا ولا يحمل سكوتهم على الرضا لتقرر الخلاف [1]

یا عالی قدر یا زبردست صاحب علم ہونا یا اختلاف ثابت ومشہور ہونا۔ چنانچہ اگر احناف وشوافع کے مجتہدین موجود ہوں اور ان میں سے کوئی ایک اپنے مذہب کے مطابق گفتگو کرے اور دوسرے سکوت اختیار کریں تو اسے اجماع نہیں کہیں گے اور ان کا سکوت رضا پر محمول نہیں ہوگا کیونکہ اختلافات مشہور ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عدم انکار کی وجہ محض یہ ہو کہ مجتہدین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مذاہب مدون اور حوادثِ واردہ کو مکمل حاوی نہ تھے۔ اس صورت میں اگر سائل کو کسی خاص صحابی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ پر مقید کیا جاتا تو حرج عظیم واقع ہوتا اور اس کی بہت سی دینی ضروریات تشنۂ تکمیل رہ جاتیں۔ بخلاف زمانۂ ائمہ اربعہ کے کہ ان حضرات کے مذاہب پیش آمدہ تمام حوادث و مسائل کو کلیۃً یا جزئیۃً حاوی ہیں۔ الحاصل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے محض سکوت اور عدم انکار سے "اجماع" کا انعقاد مستبعد ہے۔

اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ صحابۂ کرام کا مسئلہ مذکورہ میں اجماع تھا تو یہ بربنائے ضرورت تھا اور انھیں حضرات کے زمانے کے ساتھ خاص تھا۔ کیوں کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مذاہب غیر مدون اور ان کے اصول وضوابط غیر منضبط تھے۔ ان کے اقوال وفتاویٰ تمام حوادث ووقائع کے احکام پر حاوی نہ تھے۔ اس لیے ضرورت متقاضی تھی کہ کسی بھی طالب کو کسی خاص مجتہد پر منحصر نہ رکھا جائے۔ بعد کے ادوار میں یہ ضرورت مرتفع ہوگئی اس لیے بربنائے ضرورت جو اجماع تھا وہ بھی باقی نہ رہا۔

---

[1] بحوالہ انتصار الحق ص ۹۳ مصنفہ مولانا ارشاد حسین صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ

صاحب مدار الحق رح فرماتے ہیں:

ان الناس کانوا فی عہد الصحابۃ رض غیر ملتزمین مذھب احد لاجل الضرورۃ المذکورۃ فانتھی الحکم بانتھاء العلۃ [1]

ترجمہ: بے شک لوگ عہد صحابہ رض میں ضرورۃِ مذکورہ کی وجہ سے کسی ایک مذہب پر مجتمع نہیں تھے۔ اب اس علت کے نہ رہ جانے کی وجہ سے حکم بھی نہیں رہا۔

علامہ شیخ شرف الاسلام ابوالفتح بغدادی الشافعی رح کتاب الاصول میں تحریر فرماتے ہیں:

اما قولہم ان الصحابۃ رض ما کلفوا العوام تقلید واحد معین فانما جاز ذالک لانہ لم یظہر لکل منہم الاصول والقواعد ما یفی باحکام الحوادث والوقائع فانہم اشتغلوا بتوسیع الخطۃ وخصہم اللہ تعالٰی بتلک الفضیلۃ واتاح ......

....

لمن جاء بعدہم بفضلہ تہذیب الاصول وتفریع المسائل [2]

ترجمہ: رہا لوگوں کا یہ کہنا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عوام کو واحد معین کی تقلید کا مکلف نہیں کیا تھا۔ تو یہ اس لیے جائز تھا کہ ان حضرات میں سے کسی کے بھی اصول و قواعد سامنے نہیں آئے تھے جو احکام حوادث اور وقائع کے سلسلہ میں کافی ہوتے کیوں کہ وہ فتوحات اسلامیہ میں مشغول تھے اور یہ فضیلت خدا نے انھیں کے حصہ میں رکھی تھی۔ اور ان کے بعد والوں کو اللہ تعالٰی نے اپنے فضل سے تہذیب اور تفریعِ مسائل کی توفیق مرحمت فرمائی۔

صاحب مدار الحق رح ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فان قیل الیس فی عہد الصحابۃ کان الواحد من الناس مخیراً

ترجمہ اگر یہ کہا جائے کہ کیا عہد صحابہ کرام رض میں یہ نہیں تھا کہ کسی بھی انسان کو اختیار رہتا کہ وہ بعض مسائل میں

---

[1] مدار الحق ص ۳۲۰ [2] بحوالہ انتصار الحق ص ۹۴

بین ان یاخذ فی بعض الوقائع بمذھب الصدیق الاکبرؓ فی بعض اُخر بمذھب الفارق قلت انما کان کذالک لان اصول الصحابۃ لم تکن کافیۃ لعامۃ الوقائع ولا شاملۃ لکافۃ المسائل لانھم لم یتفرغوا الی تفریع التفاریع وتمھید الاصول وتفاصیل فلاجل الضرورۃ یحل للمقلد اتباع الصدیق الاکبر فی بعض الوقائع واتباع الفارق فی بعضھا واما فی زماننا ھذا فمذاھب الائمۃ کافیۃ بمعرفۃ الکل فلا ضرورۃ الی اتباع الامامین[1] ۔

صدیق اکبرؓ کے مسلک کو اختیار کرے اور بعض دوسرے مسائل میں فاروقِ اعظمؓ کے مسلک پر چلے ۔ تو میں یہ کہوں گا کہ یہ اس بنا پر تھا کہ صحابۂ کرامؓ کے اصول عام واقعات اور تمام مسائل کو حاوی نہیں تھے کیونکہ ان حضرات کو اصول وتفاصیل بیان کرنے تفریعات متفرع کرنے کی فراغت نہیں تھی تو اس ضرورت کی بنا پر مقلد کے لیے درست تھا بعض معاملات میں کہ صدیق اکبرؓ اور بعض دوسرے معاملات میں فاروقِ اعظمؓ کی تقلید کرے اب ہمارے زمانے میں مذاہبِ اربعہ تمام مسائل کی معرفت کے لیے کافی ہیں اس لیے دو اماموں کی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ۔

تقلید ائمۂ اربعہ پر دوسرا شبہہ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب ائمۂ اربعہ میں سے ہر ایک نے فرمایا ہے کہ "اذا اصح الحدیث فھو مذھبی"، یعنی جب ہمارے قول کے برخلاف کوئی حدیث مل جائے تو چاہیے کہ حدیث ہی پر عمل کیا جائے کہ وہی ہمارا مذہب ہے ۔ اس قول میں ان حضرات نے خود اپنی تقلیدِ کلّی سے منع فرمادیا ہے ۔ پھر لوگ انھیں کی تقلید پر کیوں مُصر ہیں ؟

شبۂ ثانیہ کا جواب اس شبہ کے جواب میں صاحب نظام الاسلام حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق نقل فرماتے ہیں :

[1] مدار الحق ص ۴۲۹

" بعض علماء نے مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی روایت سے یوں لکھا ہے.
چاروں مجتہدوں نے جو فرمایا ہے کہ جو کوئی ہمارے قول کو برخلاف حدیث صحیح کے
پاوے تو چاہیے کہ وہ حدیث پر عمل کرے کہ فی الحقیقت ہمارا مذہب یہی ہے تو
یہ کہنا ان کے زمانے سے علاقہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ ان کے بعد اجتہاد جاتا رہا تقلید
لازم ہوئی اس لیے بعد ان کے جتنے علماء گزرے با وجودیکہ ان کو مسائل کے نکالنے کی
قوت۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا علم اور فقیہوں کے اختلاف کی شناسائی
تھی پھر بھی وہ اجتہاد کی راہ نہ چلے اسی واسطے کہ جیسی سمجھ کی مضبوطی اور غور کی
قوت اور دل کی ستھرائی اور قلب کی روشنی اور بے طمعی اور نیت کے درستی اور خواہشِ
نفسانی سے دوری اور پرہیزگاری اور سلیقہ عربی زبان کی بوجھ کا قدیم لغتوں کے
موافق ان مجتہدوں میں تھی اپنی ذات میں انھوں نے نہ پائی اور ویسی تحقیقات
اور تلاش اور قوت مسائل کے نکالنے کی انھیں حاصل نہ ہوئی۔ اور مسئلوں کے
نادرست اور درست کرنے میں کوئی دوسری راہ سوائے ان لوگوں کے مقرر
کی ہوئی میسر نہ آئی۔ حکم کیا اجتہاد کے حرام ہونے اور چاروں اماموں کے تقلید کے
واجب ٹھہر جانے پر اور اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے کہ اچھے طریقے اور مضبوط راہ پر
چلے کہ جن میں بہت باتیں نیک پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لوگوں کی
سرشت میں یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ پر نازاں ہوتا ہے اور دوسرے کے
کمال کو اگرچہ مجملاً اس پر اعتقاد رکھتا ہو پھر بھی بسبب اس کے دل میں ایک بات
ٹھہر رہی ہے اچھی بات کو بھی ان کی قبول نہیں کرتا پھر اپنے برابر کے لوگوں کے
قول کا کیا ٹھکانہ۔ پس اس صورت میں اگر کوئی شخص اجتہاد کی شرطیں حاصل
کر کے خلاف عقلوں کے احکام جاری کرتا تو ہر کوئی کیا ناقص اور کیا متوسط۔
اپنی استعداد کے موافق ایک نئی راہ پر چلنے لگتا۔ اس میں یہاں تک
اختلاف واقع ہوتا کہ جمعیت شریعت کے احکام کی عبادات اور معاملات
کے مقدمہ میں باقی نہ رہتی اور لوٹ جاتی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا

دروازہ بند ہوجاتا چنانچہ جب تک چار مذہب پر لوگ مضبوط نہیں ہوئے تھے
اوران کی پیروی اختیار نہیں کی تھی ستر اور کئی فرقے ہو گئے تھے اور
ان کے تابعدار باقی رہ گئے۔ مگر بعد اس کے جب علماؤں نے ان چار مذہبوں کو
خوب مضبوط کیا اوران کے موافق احکام کو ہر طرف جاری فرمایا اور ایک نیا
مذہب بنانے کو باطل اور حرام ٹھیرایا تب ان چار کے سوا دوسرا مذہب
کسی نے نہ نکالا اور شاید کسی نے نکالا ہو تو بسبب اجماعِ علمائے دین دار کے
اور مدد سے بادشاہ دین پناہ کے جاری اور رواج نہونے پایا[۱]،،

اللہ کا بے پناہ شکر و احسان ہے کہ تقلید ائمہ اربعہ کے سلسلہ میں اکابرِ امت کی تحقیقات و تصریحات کا ایک ضروری حصہ پیش کر دیا گیا جو ان شاء اللہ اربابِ فہم و صلاح کے لیے حقیقتِ مسئلہ کے ادراک صحیح میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَہٗ

❊ ❊ ❊

---
[۱] نظامُ الاسلام ص ۵ - ۱۵

بابت سنہ ۱۴۱۶

پانچواں محاضرہ علمیہ

برموضوع

پیش کردہ

جناب مولانا محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ دار العلوم دیوبند

فہرست مضامین

حقیقت تراویح ۔۔۔۔۔۔ ۳

تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۴

تراویح کا ثبوت ۔۔۔۔۔۔ ۴

تراویح کا اجراء بیس رکعات کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔ ۶

مسئلہ تراویح پر تحقیقی نظر ۔۔۔۔۔۔ ۱۲

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رکعات تراویح کا صراحۃ ثبوت ۔۔۔۔۔۔ ۱۸

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف آٹھ رکعت تراویح کی نسبت ثابت نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ ۲۰

بیس رکعت تراویح پر جمہور امت کا اجماع ۔۔۔۔۔۔ ۲۲

ائمہ اربعہ بھی بیس ہی کے قائل ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۲۴

چھتیس چالیس اور اٹھائیس رکعات کی توجیہ ۔۔۔۔۔۔ ۲۵

مسئلہ تراویح پر ایک اصولی گفتگو ۔۔۔۔۔۔ ۲۷

مسئلہ طلاق ثلثہ ۔۔۔۔۔۔ ۲۸

جمہور امت کے دلائل ۔۔۔۔۔۔ ۳۲

مخالفین کے دلائل ۔۔۔۔۔۔ ۴۲

کاتب:۔ احسان الٰہی کامل نزد معراج گیٹ دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علی عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد
منجملہ ان تمام مسائل عملیہ کے جن میں فرقہ غیر مقلدین نے جمہور اہل سنت والجماعت کی شاہراہ مستقیم سے انحراف کرکے راہ شذوذ اختیار کرلیا ہے اور جو ان کے اور اہل سنت والجماعت کے مابین وجہ امتیاز بن چکے ہیں۔ یہ دو مسئلے نہایت اہم اور مشہور ہیں۔ ۱ مسئلہ تراویح ۲ مسئلہ طلاق ثلثہ۔
اس موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ ان دونوں مسئلوں پر کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

"حقیقت تراویح"

مسئلہ تراویح میں نقطۂ اختلاف پر غور کرنے سے قبل نفس تراویح کی حقیقت ذہن نشین رکھنی مناسب ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رح فتح الباری میں فرماتے ہیں۔

سُمّیت الصلوٰۃ فی الجماعۃ فی لیالی رمضان التراویح ؎۱

یعنی جو نماز رمضان المبارک میں جماعت کے ساتھ ادا کی جائے اس کا نام تراویح ہے۔

اس تعریف کی روشنی میں یہ دو باتیں بطور خاص ملحوظ رکھنی چاہئیں (۱) تراویح نماز باجماعت کو کہتے ہیں۔ (۲) وہ رمضان المبارک کی راتوں کے ساتھ خاص ہے۔
غیر مقلد عالم حافظ عبداللہ غازی پوری لکھتے ہیں "نماز تراویح وہ نماز ہے جو رمضان المبارک کی راتوں میں عشاء کے بعد پڑھی جائے۔ ؎۲

---

۱ فتح الباری ص ۱۷۰ ج ۴ ۲ ضمیمہ رکعات التراویح ص

"تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ نمازیں ہیں"

"قیامُ اللیل" اور "صلوٰۃُ اللیل" یہ دونوں عام لفظ ہیں جن کے تحت دو نمازیں آتی ہیں ایک تراویح اور دوسری تہجد۔ اس باب میں وارد تمام احادیث پر غور کرنے سے یہ فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ علمائے محققین نے ان دونوں کے مابین فرق کی صراحت کی ہے علامہ ابن قدامہ مالکیؒ المقنع میں فرماتے ہیں۔

ثم التراویح وھی عشرون رکعۃً	پھر تراویح ہے اور اس کی بیس رکعتیں ہیں۔
یقوم بھا فی رمضان فی جماعۃٍ ویوتر	جنہیں رمضان میں باجماعت ادا کرے اور
بعدھا فی الجماعۃ فان کان لہ	اسکے بعد وتر باجماعت ادا کرے اور اگر وہ
تھجدٌ جعل الوتر بعدہ [1]	تہجد کا عادی ہو تو وتر تہجد کے بعد ادا کرے۔

اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ تراویح اور تہجد دونوں الگ الگ ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنے فتاوی میں[2]۔ حضرت گنگوہیؒ نے "رسالہ تراویح[3]" اور حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکاتیب[4] میں ان دونوں کے فرق کو بدلائل واضح کیا ہے۔

"تراویح کا ثبوت"

عن عروۃ انّ عائشۃؓ اخبرتہُ	عروہ روایت کرتے ہیں کہ انہیں حضرت عائشہؓ
انّ رسولَ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم	نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک
خرجَ لیلۃً مِن جوفِ اللیلِ فصلّی فی	دفعہ وسط شب میں باہر تشریف لائے اور
المسجد وصلّی رجالٌ بصلوٰتہٖ	مسجد میں نماز ادا فرمائی اور بہت سے لوگوں نے

---

[1] المقنع ص ۱۸۷۔۱۸۸ ج ۱ [2] فتاوی عزیزی ص ۱۱۹۔ ۱۲۰ ج ۱ [3] رسالہ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ ص ۳۰۶۔ [4] لطائف قاسمی ص ۷

فاصبحَ الناسُ فتحدّثوا فاجتمعَ اکثرُ منھم فصلّٰی فصلّوا معہٗ فاصبحَ الناسُ فتحدّثوا فکثرُ اھلُ المسجدِ من اللیلۃِ الثالثۃِ فخرجَ رسولُ اللّٰہِ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم فصلّٰی فصلّوا بصلاتِہٖ فلما کانتِ اللیلۃُ الرابعۃُ عجزَ المسجدُ عن اھلِہٖ حتّٰی خرجَ لصلوٰۃِ الصبحِ فلمّا قضی الفجرَ اَقبلَ علی الناسِ فتشھّدَ ثمّ قالَ اما بعدُ فانّہٗ لم یخفَ علیّ مکانکمُ ولکنّی خشیتُ ان تفرضَ علیکمُ فتعجزُوا عنھا فتوفّی رسولُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلّمَ والامرُ علٰی ذالک۔

(صحیح البخاری ص ۲۶۹ ج ۱۔)
(صحیح مسلم ص ۲۵۹ ج ۱)

آپؐ کی نماز کی اقتدا کی۔ لوگوں نے صبح دوسرے لوگوں سے اسکا تذکرہ کیا تو دوسری رات اس سے زیادہ لوگ جمع ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور ان لوگوں نے حضورؐ کی اقتدا کی صبح پھر ان لوگوں نے تذکرہ کیا تو تیسری رات اہل مسجد اور زیادہ ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور نماز ادا کی دوسروں نے آپ کی اقتدا کی پھر چوتھی رات مسجد نمازیوں کی کثرت سے تنگ ہو گئی۔ یہانتک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے لئے تشریف لائے۔ فجر ادا کرکے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر تشہد پڑھا پھر فرمایا اما بعد بے شک تمہارا حال مجھ پر پوشیدہ نہیں تھا لیکن مجھے خوف ہوا کہ وہ تم پر فرض کر دی جائے اور تم اسکی بنا پر عاجز ہو جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک معاملہ یوں ہی رہا۔

اس روایت سے پتہ چلا کہ رمضان المبارک میں تین دن تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تراویح پڑھائی پھر لوگوں کے شدتِ ذوق وشوق کو دیکھکر اس اندیشہ سے بڑھانا ترک فرما دیا کہ کہیں فرض نہ ہو جائے کہ لوگوں کو مشقت ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر غایتِ شفقت اور رحمت کی بنیاد پر ایسا فرمایا۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ تراویح کا ثبوت حدیث مذکورہ وغیرہا سے ہجرت کے بعد ہوا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اس کیفیت کے ساتھ یہ معاملہ صرف تین راتوں تک رہا جبکہ نماز تہجد کا ثبوت " آیت کریمہ یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلاً (المزمل) اور آیت ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک (سورہ اسراء) سے ہجرت سے قبل ہوا تھا۔ (مزید تحقیق کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ ص ۳۰۶-۳۰۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں داخلی اور خارجی فتنوں کی کثرت اور مدت خلافت کی قلت کی بنا پر اس سنتِ عظیمہ کے قیام کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس سنت کو جو عارض مذکور کی بنا پر موقوف تھی لیکن اب وہ عارض چونکہ باقی نہیں رہا تھا اس لئے جاری فرما دیا۔ گویا کہ یہ سعادت عظیمہ حضرت فاروق اعظم ہی کے لئے مقدر تھی ملا علی قاری رح علامہ طیبی رح کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔

وان کانت لم تکن فی عھد ابی بکر رضی اللہ عنہ فقد صلاھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانما قطعھا اشفاقاً من ان تفرض علی امتہ وکان عمر ممن تنبہ علیھا وسنھا علی الدوام فلہ اجرھا واجر من عمل بھا الی یوم القیمۃ۔

(مرقات ص ۱۹۲ ج ۳)

اگرچہ تراویح باجماعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں نہیں تھیں لیکن چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پڑھا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں تھے جو اس حقیقت سے باخبر تھے انہوں نے دائمی طور پر جاری فرما دیا تو انھیں اس کا بھی اجر ہے اور قیامت تک جو لوگ عمل کرتے رہیں گے ان کا بھی اجر ہے۔

"تراویح کا اجراء بیس رکعات کے ساتھ"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں تراویح بیس رکعات کے ساتھ

باجماعت جاری فرمایا۔ مندرجہ ذیل روایات سے اس کا واضح ثبوت ہوتا ہے۔

(۱) بیہقی رح کی سنن کبریٰ میں ہے۔

وَقَدْ اَخْبَرَنَا ابوعَبدِ اللّٰہِ الحُسَینُ	ہمیں خبر دی ابو عبداللہ حسین ابن محمد بن
بنُ مُحمّدِ بنِ الحُسینِ بن فَنْجُوَیہ	حسین بن فنجویہ دنیوری نے دامغان میں
الدِینُوری بالدّامِغانِ ثنَا احمدُ	انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی محمد
بن مُحمدِ بنِ اِسحٰقَ السنّی ثنا	بن اسحٰق سنّی نے انہوں نے کہا ہم سے
عبد اللّٰہِ بنُ محمد بنِ عبدِ العزیز	بیان کیا عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی
البغوی ثنا علی بن الجَعدِ اَنبأ نا	نے انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا علی بن
ابنُ ابی ذئبٍ عن یزید بنِ	الجعد نے انہوں نے کہا ہمیں خبر دی۔ ابن
خُصَیفَةَ عنِ السائبِ بن یزیدَ	ابی ذئب نے یزید بن خصیفہ سے انہوں نے
قال کانوا یقُومُونَ علیٰ عَہدِ عُمَرَ	روایت کی سائب ابن یزید سے کہ لوگ حضرت
بنِ الخطّابِ رضی اللّٰہ عنہ فی	عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان المبارک
شَہرِ رَمَضانَ بِعِشرِینَ رکعةً[۲]	کے اندر بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے

محدث نیموی رح اس اثر کے رجال کے سلسلہ میں فرماتے ہیں رجال اسنادہ کلھم ثقات[۳] اس کی اسناد کے تمام راوی ثقات ہیں۔ پھر حافظ ذہبی رح کی تذکرہ الحفاظ۔ طبقات الحفاظ حافظ ابن حجر رح کی تقریب التہذیب نووی رح کی الخلاصة ابن العراقی رح کی شرح التقریب سیوطی رح کی المصابیح کے حوالہ سے ایک ایک راوی کی توثیق و تصحیح نقل کی ہے۔ (ملاحظہ ہو التعلیق الحسن ص ۵۴ ج ۲)

(۲) یہی روایت امام بیہقی نے معرفة السنن والآثار میں یزید ابن خصیفہ کے دوسرے شاگرد محمد ابن جعفر سے نقل کی ہے۔ اسکی سند کو علامہ سُبکی رح نے شرح منہاج اور

۲؎ آثار السنن والتعلیق الحسن ص ۵۳-۵۴ ج ۲ ۔ ۳؎ التعلیق الحسن ص ۵۴ ج ۲ ۔

ملا علی قاری رحؒ نے شرح موطا میں صحیح قرار دیا ہے محدث نیموی رحؒ فرماتے ہیں" وهذا الاثرُ مِنُ هٰذَا الوَجْهِ قد صحّحَ اِسنادَهُ العلامةُ السُبکی فی شرحِ المِنهاج وعلی القاری فی شرح الموطا۔ (التعلیق الحسن علی آثار السنن ص ۵۵ ج ۲)

یزید ابن خصیفہ کے دونوں شاگرد ۱ محمد بن جعفر ۲ ابن ابی ذئب متفق اللفظ ہیں کہ وہ سائب ابن یزید سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ عہد فاروقی میں بیس رکعات پڑھتے تھے۔

(۳) موطا امام مالک رحؒ میں ہے

عَنْ یزیدَ ابنِ رُوْمَانَ کانَ النّاسُ یقُوْمُوْنَ فی زمانِ عُمَرَ بنِ الخطّابِ فی رمضانَ بثلاثٍ وعِشْرِیْنَ رکعۃً (موطا امام مالک

یزید ابن رومان سے مروی ہے کہ لوگ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان المبارک میں ۲۳ رکعتیں پڑھتے تھے۔

(۴) عن عبدِ العزیزِ بن رفیعٍ قال کان اُبیُّ ابنُ کعبٍ یُصلّی بالناسِ فِی رَمضانَ بِالمدِینَۃِ عِشْرِیْنَ رکعۃً ویُوتِرُ بِثلاثٍ أخْرجہُ ابوبکرِ بنُ ابی شیبۃَ فی مُصَنَّفِہٖ واسنادہ مُرسلٌ قویٌّ (آثار السنن ص ۵۵ ج ۲)

عبد العزیز ابن رفیع سے مروی ہے کہ ابی ابن کعب رضؓ لوگوں کو رمضان المبارک میں مدینہ شریف کے اندر بیس رکعات اور تین وتر پڑھاتے تھے اس روایت کو ابوبکر ابن ابی شیبہ رحؒ نے اپنے مصنَّف میں بیان کیا ہے اور اس کی سند قوی مرسل ہے۔

(۵) عَنْ یحییٰ بنِ سعیدٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الخطّابِ رضؓ اَمَرَ رَجُلاً یُصلّی بھمْ عِشْرِیْنَ رکعۃً رواہُ ابوبکر

یحییٰ ابن سعید سے مروی ہے کہ عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے

بنُ ابی شیبۃَ فی مُصنّفِہٖ واسنادُہٗ مُرْسَلٌ قویٌ۔ (آثار السنن ص ۵۵ ج ۱)

اس روایت کو ابو بکر ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں بیان کیا اور اس کی سند مرسل قوی ہے۔

ان پانچ آثار میں سے پہلا اور دوسرا اثر تو صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ محدث نیموی رح نے "آثار السنن" میں۔ اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی رح نے "رکعات تراویح" میں ان دونوں کے رواۃ کی محدثانہ تحقیق کر کے کتب اسمائے رجال سے توثیق کی ہے۔ مولانا عبد الرحمن مبارکپوری رح نے پہلی روایت کے راوی اول ابو عبد اللہ بن فنجویہ۔ اور دوسری روایت کے دو راوی ۱۔ ابو طاہر ۲۔ ابو عثمان پر واہی اعتراض کئے ہیں جن کا مولانا اعظمی رح نے نہایت ہی کافی اور شافی جواب دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو رکعات تراویح ص ۴۱ تا ۴۹)

تیسرا اثر مرسل ہے اس لئے کہ یزید ابن رومان نے حضرت عمر رض کا زمانہ نہیں پایا۔ لیکن یہ مرسل چونکہ موطا امام مالک رح میں ہے اور موطا کے مراسیل روایات متصلہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

قالَ الشافِعیُ رح اَصَحُّ الکتبِ بعدَ کتابِ اللّٰہِ المُوطا مالکٌ رح واتّفقَ اھلُ الحدیثِ علیٰ اَنَّ جَمِیعَ ما فیہِ صحیحٌ علیٰ رأیِ مالکٍ وَمَنْ وَافقہٗ واَمّا علیٰ رَأیِ غَیرہٖ فلیسَ فِیہِ مُرسلٌ ولا مُنقطعٌ اِلا قَدْ اتّصَلَ السندُ بہٖ من طرقٍ اخریٰ

حضرت امام شافعی رح فرماتے ہیں کتاب اللہ کے بعد سب کتابوں میں زیادہ صحیح کتاب امام مالک کی موطا ہے اور اہل حدیث متفق ہیں کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق موطا کی تمام احادیث صحیح ہیں (اس لئے کہ وہ لوگ مرسل کو بھی صحیح اور مقبول مانتے ہیں) اور دوسرے

فَلَاجَرَمَ اَنَّهَا صَحِيْحَةٌ مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ وَقَدْ صُنِّفَ فِيْ زَمَانِ مَالِكٍ مُوَطَّآتٌ كَثِيْرَةٌ فِيْ تَخْرِيْجِ اَحَادِيْثِهٖ وَوَصْلِ مُنْقَطِعِهٖ مِثْلُ كِتَابِ ابْنِ اَبِيْ ذِئْبٍ وَابْنِ عُيَيْنَةَ وَالثَّوْرِيِّ وَمَعْمَرٍ

(حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۳۳ ج ۱)

محدثین کی رائے کے مطابق اس میں کوئی مرسل اور منقطع حدیث ایسی نہیں ہے کہ دیگر طرق سے اسکی سند متصل نہ ہو پس اسوجہ سے موطا کی تمام احادیث صحیح ہی ہیں۔ امام مالکؒ کے زمانے میں بہت سی موطا تصنیف ہوئیں جن میں موطا امام مالک کی احادیث کی تخریج کی گئی اور اس کی منقطع احادیث کو متصل کیا گیا جیسے ابن ابی ذئب ابن عیینہ ثوری اور معمر وغیرہ کی کتابیں۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ ثقہ کا مرسل تو امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مطلقاً مقبول ہے خطیب بغدادیؒ کفایہ میں لکھتے ہیں۔

فَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَّهٗ مَقْبُوْلٌ وَيَجِبُ الْعَمَلُ بِهٖ اِذَا كَانَ الْمُرْسِلُ ثِقَةً عَدْلًا وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَاَبِيْ حَنِيْفَةَ وَاَهْلِ الْعِرَاقِ وَغَيْرِهِمْ

بعض علماء نے فرمایا کہ مرسل مقبول ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے جب ارسال کرنے والا ثقہ اور عدل ہو یہی امام مالکؒ اہل مدینہ امام ابو حنیفہؒ اور اہل عراق وغیرہ کا قول ہے۔

(کفایہ ص ۳۸۴ بحوالہ رکعات تراویح ص ۴۶)

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک مرسل اگرچہ مقبول نہیں ہے لیکن اس مرسل کی تائید دوسرے طریق سے مروی کسی مرسل یا مسند سے ہو جائے تو پھر وہ مقبول ہے علامہ ابن حجرؒ شرح نخبہ میں فرماتے ہیں۔

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ يُقْبَلُ اِذَا اعْتَضَدَ بِمَجِيْئِهٖ مِنْ وَجْهٍ آخَرَ يُبَايِنُ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مرسل قابل قبول ہے جبکہ طریق اول کے علاوہ

الطریق الاولی مُسنداً اکانَ اومُرسلاً۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۵۱)

کسی دوسرے طریق سے اسے مضبوط کر دیا جائے دوسری روایت چاہے مرسل ہو یا مسند۔

چوتھا اور پانچواں اثر بھی مرسل ہے کیونکہ عبدالعزیز ابن رفیع نے ابی ابن کعب رضؓ کو یحییٰ ابن سعید انصاری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا لیکن یہ دونوں اثر یزید ابن رومان کے اثر کے مؤید ہونے کی وجہ سے مقبول ہیں۔ بہرحال ان پانچوں روایات سے ثابت ہو گیا کہ عہد فاروقی میں خود حضرت فاروق اعظم رضؓ کے حکم سے بیس رکعت تراویح کا عمل جاری ہوا۔ اور اس وقت سے امت پر ہمیشہ کے لئے لازم ہو گیا۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ

(رواہ الترمذی وقال ہذا حدیث حسن صحیح)

(ترمذی شریف ص ۹۲ ج ۲)

میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت لازم پکڑو اور انہیں اپنے دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ دبا لو۔

شراح حدیث لکھتے ہیں۔

فَإِنَّ لفظ عليكم يَدُلُّ عَلَى اللُّزُومِ وَضْعًا والمَعْطُوفُ فِي حُكْمِ المعطوفِ عَلَيْهِ لغةً فَثَبَتَ بِهِ لُزُومُ سنةِ الخُلَفَاءِ كَلُزُومِ سُنَّةِ الرَّسُولِ صلى الله عليه وسلم

(اعلاء السنن ص ۷۰ ج ۷)

بے شک لفظ "علیکم" باعتبار وضع لزوم پر دلالت کرتا ہے اور معطوف باعتبار لغت معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے تو حدیث سے ثابت ہوا کہ خلفائے راشدین کی سنت بھی لازم ہے جس طرح خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت لازم ہے۔

چنانچہ اسی وقت تمام امت کا اس پر اجماع ہو گیا۔

علامہ نووی رحؒ فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَقَرَّ الْاَمْرُ عَلٰی عِشْرِیْنَ فَاِنَّہ الْمُتَوَارِثُ۔ (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

پھر بیس پر عمل قرار پا گیا اور وہی سلف سے خلف تک چلا آرہا ہے۔

ابن حجر رحؒ مکی فرماتے ہیں۔

اَجْمَعَ الصَّحَابَۃُ عَلٰی اَنَّ التَّرَاوِیْحَ عِشْرُوْنَ رَکْعَۃً (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعات ہیں۔

مسئلہ تراویح پر تحقیقی نظر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح کی بیس رکعات کا تعین اگرچہ روایات صحیحہ میں صراحۃً وارد نہیں ہوا ہے۔ لیکن روایات صحیحہ سے بدرجۂ تواتر یہ ثابت ہوکر کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات خصوصاً نمازیں رمضان المبارک کے ایام میں دیگر ایام کی بنسبت نمایاں طور پر بڑھ جاتی تھیں۔

صحیح مسلم کی روایت ہے۔

قَالَتْ عَائِشَۃُ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَجْتَہِدُ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا یَجْتَہِدُ فِیْ غَیْرِہٖ (صحیح مسلم ص ۳۷۲ ج ۱)

حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کے آخری عشرے میں دیگر ایام کی بنسبت زیادہ عبادت کے سلسلہ میں جد وجہد فرماتے تھے۔

صحیحین کی روایت ہے۔

عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آخری عشرہ آجاتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

أَحْيىٰ اللَّيْلَ وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ وَجَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرِ (صحیح البخاری ص ۲۷۱ ج ۱ و صحیح مسلم ص ۳۷۲ ج ۱)

راتوں کو زندہ رکھتے اور اپنے اہل خانہ کو بیدار فرماتے اور عبادت میں کوشش کرتے اور حد درجہ مستعد ہو جاتے تھے۔

انہیں روایات کے پیش نظر نواب صدیق صاحب رح فرماتے ہیں۔

إِنَّ صَلٰوةَ التَّرَاوِيحِ سُنَّةٌ بِأَصْلِهَا لِمَا ثَبَتَ أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّاهَا فِي لَيَالِي ثُمَّ تَرَكَ شَفَقَةً عَلَى الْأُمَّةِ أَنْ لَا تَجِبَ عَلَى الْعَامَّةِ أَوْ يَحْسِبُوهَا وَاجِبَةً وَلَمْ يَأْتِ تَعْيِينُ الْعَدَدِ فِي الرِّوَايَاتِ الصَّحِيحَةِ الْمَرْفُوعَةِ وَلٰكِنْ يُعْلَمُ مِنْ حَدِيثِ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي رَمَضَانَ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهِ رَوَاهُ مُسْلِمٌ أَنَّ عَدَدَهَا كَانَ كَثِيرًا (الانتقاد الرجیح ص ۶۱ بحوالہ رکعات تراویح ص ۹۵)

اصل نماز تراویح سنت ہے اس لئے کہ ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں میں اس کو پڑھا، پھر امت پر شفقت کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا کہ کہیں عام لوگوں پر واجب نہ ہو جائے یا لوگ اس کو واجب نہ سمجھ بیٹھیں اور عدد کی تعیین صحیح مرفوع روایتوں میں نہیں آئی ہے۔ لیکن صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے "کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں جتنی کوشش اور محنت کرتے تھے وہ اور دنوں سے زیادہ ہوتی تھی" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی تراویح کا عدد زیادہ تھا۔

الحاصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں رمضان المبارک میں اور دنوں کی بنسبت یقیناً زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ شبہ گذرتا ہے کہ حضرت عائشہ کی وہ حدیث جو صحیح بخاری وغیرہ میں ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں رمضان المبارک میں، غیر رمضان کی طرح گیارہ رکعات سے

زائد نہیں ہوا کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں۔

مَا کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلَّمَ یَزِیدُ فی رَمضَانَ وَلَا فِی غَیرِہٖ عَلیٰ إِحدٰی عَشرَ رَکعَۃً	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں بڑھاتے تھے۔

(صحیح البخاری ص ۱۵۴ ج ۱)

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حدیث عائشہ رضؓ تہجد کے سلسلہ میں ہے۔ تہجد اور تراویح کا فرق مدلّل طریقہ سے واضح کیا جا چکا ہے۔ حافظ ابن حجر رحؒ کے قول سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث عائشہ باب تہجد میں وارد ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

وَظَھَرَ لِی اَنَّ الحِکمَۃَ فِی عَدَمِ الزِّیَادَۃ عَلیٰ إِحدٰی عَشرَ رَکعَۃً اَنَّ التَّھَجُّدَ وَالوِترَ مُختَصٌّ بِصَلوٰۃِ اللَّیلِ (فتح الباری ص ۱۴ ج ۳)	مجھے یہ بات ظاہر ہوئی کہ گیارہ رکعت پر زیادہ نہ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ تہجد اور وتر صلواۃ اللیل کے ساتھ خاص ہیں۔

وہ احادیث جن سے رمضان المبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کی کثرت کا پتہ چلتا ہے اور یہ حدیث جس میں ۱۱ رکعات سے زیادتی کی نفی ہو رہی ہے ان احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

پس وجہ تطبیق درمیان ایں روایات کہ صریح دلالت بر زیادتی یعنی وکمی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم در رمضان بر غیر آں میکنند و در آں روایت کی نفی زیادت می کُند ہمیں است۔ کہ آں روایت	پس تطبیق ان صریح روایتوں کے درمیان جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں میں کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے رمضان المبارک میں غیر رمضان کی بنسبت زیادتی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اس روایت کے

محمول بر نماز تہجد است کہ در رمضان و غیر رمضان یکساں بود غالباً بعدد یازدہ رکعت مع الوتر می رسد دلیل بریں حمل آنست کہ راوی ایں حدیث ابوسلمہ است در تتمہ ایں روایت میگوید کہ قالت عائشۃ فقلت یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنام قبل ان توتر قال یا عائشۃ ان عینی تنامان ولا ینام قلبی کذا رواہ البخاری ظاہر است کہ نوم قبل از وتر در نماز تہجد متصور شود نہ در غیر آں ۔ و روایات زیادت محمول بر نماز تراویح است کہ در عرف آں زماں بقیام رمضان معبر بود ۔

(فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۸ ج ۱)

درمیان جو زیادتی کی نفی کرتی ہے یہی ہے کہ یہ روایت نماز تہجد پر محمول ہے جو کہ رمضان اور غیر رمضان میں یکساں تھی ۔ اس کی تعداد وتر سمیت عموماً گیارہ تک پہونچتی تھی ۔ اس بات کہ دلیل یہ ہے کہ روایت کے راوی ابوسلمہ حدیث کے آخر میں کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ وتر سے پہلے سو جاتے ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری آنکھیں سو جاتی ہیں میرا دل نہیں سوتا جیسا کہ اسکو بخاری نے بیان کیا ۔ ظاہر ہے کہ وتر سے پہلے سونے کا تصور نماز تہجد میں ہے نہ کہ کسی اور نماز میں وہ روایات جن سے زیادتی کا پتہ چلتا ہے وہ نماز تراویح پر محمول ہیں ۔ جسے اسوقت قیام رمضان کہا جاتا تھا ۔

ان مباحث کا خلاصہ یہی ہے کہ ان تین راتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تراویح پڑھائی اس کی کوئی معین تعداد روایات صحیحہ مرفوعہ سے ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد زیادہ تھی ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب رحؒ فرماتے ہیں ۔

آمدیم بر آں کہ قیام رمضان بچند رکعت ادا

ہم اس نتیجہ پر آئے کہ قیام رمضان آپ نے

میفرمودند در روایات صحیحہ مرفوعہ تعیین عدد نیامدہ لیکن از الفاظ مذکورہ در جد و اجتہاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معلوم شود کہ عددش بسیار بود۔

(فتاوی عزیزی ص ۱۱۹ ج ۱)

کتنی رکعات کے ذریعہ فرمایا۔ روایات صحیحہ مرفوعہ میں عدد کی تعیین نہیں آئی ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت اور کوشش کے سلسلہ میں آئے ہوئے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعداد زیادہ تھی۔

۱۔ الحاصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام رمضان رکعات کی کثرت کے ساتھ تھا۔

۲۔ کثرت کی تعیین روایات صحیحہ سے نہیں ہو سکی۔

یہاں یہ بات حل طلب ہے کہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات کی تعیین اور تحدید کس بنیاد پر فرمائی۔ اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی عملاً بیس ہی پر اجماع کر لیا؟ اس خدشہ کا واضح حل یہی ہے کہ جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنی زبان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال مبارکہ نقل کرتے ہیں اور وہ دلائل شرعیہ ہوتے ہیں اسی طرح وہ اپنے اعمال وافعال سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افعال مبارکہ کی نقل ان کی تنفیذ اور اجراء فرماتے ہیں اور وہ بھی دلیل شرعی ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

أَمَّا رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیہ وسلم فَکَانَ یَتَوَضَّأُ فَیَرٰی الصَّحَابَةُ وَضُوءَهُ فَیَأْخُذُوْنَ بِهٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّبَیِّنَ اَنَّ هٰذَا رُکْنٌ وَذٰلِكَ اَدَبٌ وَکَانَ یُصَلِّیْ فَیَرَوْنَ صَلَاتَهٗ فَیُصَلُّوْنَ کَمَا

رہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک تو آپ وضو فرماتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے وضو کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے تھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے کہ یہ رکن ہے وہ مستحب ہے۔ اور آپ نماز پڑھتے تھے پس صحابہ رضی اللہ عنہم جس

رَأَوْہُ یُصَلِّیْ وَحَجَّ فَرَمَقَ النَّاسُ حَجَّتَہٗ فَفَعَلُوْا کَمَا فَعَلَہٗ،
(حجۃ اللہ البالغۃ ص ۳۳۰ ج ۱)

طرح آپ کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تھے اسی طرح خود بھی نماز پڑھتے تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا پس لوگوں نے بھی دیکھ کر ویسے ہی افعال حج ادا کئے جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے۔

مدینہ کے حضرات چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپؐ کے اعمال کو دیکھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے والے تھے اسی بنیاد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تعامل اہل مدینہ بھی دلیل شرعی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

وَلِذَالِکَ تَرٰی مَالِکًا یُلَازِمُ مُحَجَّتَھُمْ
(حجۃ اللہ البالغۃ ص ۱۴۴ ج ۱)

اسی بنا پر امام مالکؒ اہل مدینہ کے تعامل کو لازم سمجھتے تھے۔

یہ بات محقق ہے کہ سیدنا فاروق اعظم کے زمانے میں تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ عمل اور اس پر کسی کا بھی اختلاف نہ کرنا یہ اسی قبیل سے ہے یقیناً ان حضرات کی نگاہوں میں اس کے مآخذ اور دلائل رہے ہوں گے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل دیکھا ہوگا۔ اگرچہ بعد والوں کی نگاہوں میں وہ دلائل اس قوت کے ساتھ مستحضر نہیں رہ گئے۔ اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بہر حال درین جا قاعدہ کلیہ را ملحوظ نظر باید فرمود کہ در وقت اجماع و اتفاق اہل حل وعقد بر امرے از امور شرعیہ دلائل و مآخذ آں امر از طرق شتی و مسالک متعددہ بر قلوب

بہر حال اس جگہ یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ امور شرعیہ میں سے کسی امر پر اہل حل وعقد کے اجماع کرنے کے وقت اس چیز کے دلائل و مآخذ اس زمانے کے لوگوں کے

اہل عصر وارد می شود و بہیت مجموعہ موجب تیقن یا ظن غالب بحکم آں امر میشود اگر از دیگراں کہ دراں وقت حاضر بودہ اند ہر ہر دلیل را فرادی فرادی نظر کنند نزد ایشاں موجب غلبۂ ظن یا تیقن نمی شود لیکن در حق ایشاں اجماع منعقد در زمان سابق در دلیل بودن کفایت می کند۔

(فتاوی عزیزی ص ۱۲۰ ج ۱)

دلوں پر وارد ہوتے ہیں اور ہیئت مجموعی اس چیز کے یقین یا ظن غالب کا فائدہ دیتے ہیں اگر وہ لوگ جو اس زمانے میں موجود نہیں تھے ہر ہر دلیل پر الگ الگ غور کریں تو انھیں یقین یا ظن غالب حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ان کے حق میں وہ اجماع جو پہلے ہو چکا ہے دلیل کافی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲۰ رکعات تراویح کا صراحۃً ثبوت

جیسا کہ اوپر گذر چکا کہ روایات صحیحہ مرفوعہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس ۲۰ رکعات تراویح کا بالتصریح ثبوت نہیں ہے لیکن بعض نسبۃً کم درجہ روایات سے بیس رکعات تراویح کی نسبت خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً ثابت ہے اور ان روایات کو بھی بے اصل نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ فعل صحابہ رضؓ اور اجماع صحابہ رضؓ سے مؤکد ہونے کی وجہ سے درجۂ استدلال میں قوی ہو جاتی ہیں ان روایتوں میں سے دو کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ پہلی روایت کو ملّا علی قاری رحؒ نے مصنف ابن ابی شیبہ اور دوسری کو بیہقی کی سنن کبریٰ کے حوالے سے مرقاۃ میں نقل کیا ہے۔

(۱) اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ کَانَ یُصَلِّیْ بِھِمْ فِیْ رَمَضَانَ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً سِوَی الْوِتْرِ۔

(مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو رمضان المبارک میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھاتے تھے۔

(۲) اَنَّہٗ صَلّٰی بِھِمْ عِشْرِیْنَ رَکْعَۃً بِعَشْرِ تَسْلِیْمَاتٍ
(مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)

بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیس رکعات دس سلاموں کے ساتھ پڑھائی۔

ان دونوں روایتوں کو نقل کر کے ملا علی قاری نے ابن حجرؒ کے واسطے سے لکھا ہے۔

لٰکِنِ الرِّوَایَتَانِ ضَعِیْفَتَانِ
(حوالہ سابقہ)

لیکن یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔

بیہقیؒ وغیرہ نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے ضعیف کی بنیاد یہ ہے کہ ان دونوں کی اسناد میں ایک راوی ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان ہیں اور وہ مجروح راوی ہیں ان روایتوں پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ صحیحین میں آئی ہوئی حضرت عائشہؓ کی روایت مَاکَانَ یَزِیْدُ فِی رَمَضَانَ وَلَا فِی غَیْرِہٖ عَلٰی اِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ رَکْعَتًا" کی مخالف ہیں دوسرے اعتراض کا تفصیلی جواب گذر چکا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ان دونوں باتوں کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

در مصنف ابن ابی شیبہ وسنن بیہقی بروایت ابن عباسؓ وارد شدہ کہ کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وعلی آلہ وسلم یُصلی فی رمضان فی غیر جماعۃٍ بعشرین رکعۃ والوتر امام بیہقی این روایت را تضعیف نمودہ بآنکہ راوی ایں حدیث جدّ ابوبکر ابن ابی شیبہ است حال آنکہ ابو شیبہ جدّ ابوبکر ابن ابی شیبہ آنقدر

مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بغیر جماعت کے (بھی) بیس رکعات اور وتر پڑھتے تھے۔ لیکن بیہقی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے اس بنیاد پر کہ اس حدیث کے راوی ابوبکر ابن ابی شیبہ کے دادا ہیں حالانکہ ابوبکر ابن ابی شیبہ

ضعف ندارد کہ روایت اور ا مطروح مطلق ساختہ شود۔ اگر معارض او حدیث صحیح می شد البتہ ساقط می گشت۔ وَقَدْ سَبَقَ اَنَّ مَا یُتَوَهَّمُ مُعَارِضًا لَهٗ اَعْنِیْ حَدِیْثَ اَبِیْ سَلْمَۃ عَنْ عَائِشَۃَ الْمُتَقَدِّمُ ذِکْرُهٗ لَیْسَ مُعَارِضًا لَهٗ بِالْحَقِیْقَۃِ فَبَقِیَ سَالِمًا۔ کَیْفَ وَقَدْ اُیِّدَ بِفِعْلِ الصَّحَابَۃِ رض (فتاویٰ عزیزی ص ۱۲۰-۱۲۱ ج ۱)

کے دادا ابو شیبہ اسقدر ضعیف نہیں ہیں کہ ان کی روایت مطلقاً ترک کردی جائے ہاں اگر حدیث صحیح اس کے مخالف ہوتی تو البتہ ترک کردی جاتی۔ اور یہ بات گذر چکی ہے، جس حدیث کو اس کا معارض سمجھا جاتا ہے یعنی ابو سلمہ عن عائشہ والی حدیث جس کا ذکر گذر چکا تو وہ درحقیقت اس کی معارض نہیں اس لیے یہ حدیث سالم رہی اور ساتھ فعل صحابہ رض سے مؤید بھی ہوگئی۔

ثابت ہوا کہ (۱) یہ حدیث اس قدر ضعیف نہیں ہے کہ ترک کردی جائے۔ (۲) کسی حدیث صحیح کی معارض بھی نہیں ہے (۳) عمل صحابہ کرام رض سے مؤیَّد ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آٹھ رکعت تراویح کی نسبت ثابت نہیں ہے

اوپر مفصلاً گذر چکا ہے کہ حدیث عائشہ رض تہجد کے سلسلہ میں ہے اس لئے اس سے رکعاتِ تراویح ثابت کرنا۔ ع۔ چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا کی قبیل سے ہے آٹھ رکعت کے ثبوت میں اس روایت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے جو صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں ان الفاظ سے مروی ہے۔

عن جابر رض صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ ثَمَانَ رَکَعَاتٍ وَاَوْتَرَ (بحوالہ مرقاۃ)

حضرت جابر رض فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ میں آٹھ رکعات پڑھائی پھر

ص ۱۹۴ ج ۳ آثار السنن ص ۵۱ ج ۱) وتر پڑھایا۔

حضرت جابرؓ سے اس حدیث کے روایت کرنے کے سلسلہ میں عیسیٰ ابن جاریہ منفرد ہیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ فرماتے ہیں "ان کا ذکر حافظ ذہبیؒ نے میزان الاعتدال اور حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب وغیرہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام فن جرح و تعدیل یحییٰ ابن معینؒ نے انکی نسبت لکھا ہے "لیس بذاك" وہ قوی نہیں ہیں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے پاس متعدد منکر روایتیں ہیں اور امام نسائیؒ اور امام ابو داؤدؒ نے کہا ہے وہ منکر الحدیث ہیں اور امام نسائیؒ نے ان کو متروک بھی کہا ہے ساجیؒ اور عقیلیؒ نے ان کو ضُعفاء میں ذکر کیا ہے اور ابن عدیؒ نے کہا ہے کہ ان کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں (یعنی شاذ و منکر ہیں۔)

یہ سات حضرات ہیں جنہوں نے عیسیٰ ابن جاریہ پر جرح کی ہے اور ان کے مقابل میں صرف ایک ابو زرعہ ہیں جنہوں نے " لا باس به " (ان میں کوئی مضائقہ نہیں) کہا ہے۔ اور دوسرے ابن حبان ہیں جنہوں نے انکو ثقاۃ میں ذکر کیا ہے اور اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ جرح مفسّر تعدیل پر مقدم ہوتی ہے لہذا عیسیٰ اصولاً مجروح قرار پائیں گے بالخصوص جبکہ عیسیٰ پر جو جرحیں کی گئی ہیں وہ بہت سخت ہیں چنانچہ امام نسائی اور ابو داؤد نے ان کو منکر الحدیث لکھا ہے۔ (رکعات تراویح ص ۲۷-۲۸)

ملا علی قاریؒ اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں۔

اجمع الصحابةؓ علی ان التراویح عشرون رکعة (مرقاة ص ۱۹۴ ج ۱) — صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اجماع ہے تراویح بیس رکعات ہیں۔

صاحب آثار السننؒ نے امام طبرانیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لَا یُرْوٰی عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ اِلَّا بِھٰذَا الْاِسْنَادِ (التعلیق الحسن علی — یعنی حضرت جابرؓ سے بجز اس سند کے کسی دوسری سند سے یہ حدیث

آثار السنن ص ۵۱ ج ۱) مروی نہیں ہے۔

ان تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اس حدیث کے راوی عیسیٰ ابن جاریہ مجروح ہیں (۲) اجماع صحابہ رضا اس روایت کی تائید اور تقویت نہیں کرتا (۳) کوئی دوسرا اس کا مؤید اور مُتابع موجود نہیں ہے ان وجوہات کی بنا پر یہ روایت پایۂ استدلال سے ساقط ہو جاتی ہے۔

بیس۲۰ رکعت تراویح پر جمہور اُمّت کا اجماع

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ ناقابل انکار حقیقت واضح ہو گئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور مبارک سے بیس رکعت تراویح پر اجماع ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ۱؎ سائب ابن یزید ۲؎ یزید ابن رومان ۳؎ عبد العزیز بن رفیع ۴؎ یحییٰ ابن سعید کے آثار سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس رکعات ہی پڑھتے تھے۔ سائب ابن یزید کے اثر کے آخری الفاظ ہیں۔

وَكَانُوا يَتَوَكَّئُونَ عَلَى عِصِيِّهِمْ فِي عَهْدِ عُثْمَانَ ابْنِ عَفَّانَ رض مِنْ شِدَّةِ الْقِيَامِ (آثار السنن ص ۵۳ ج ۲)

حضرت عثمان ابن عفان عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں لوگ شدت قیام کی وجہ سے اپنے اپنے عصا پر ٹیک لگاتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے دو نو پیشروؤں کی طرح بیس رکعات ہی کا حکم فرماتے تھے۔ جیسا کہ اِن آثار سے معلوم ہوتا ہے۔

(۱) وَقَالَ الْبَيْهَقِيُّ فِي سُنَنِهِ وَرُوِّينَا عَنْ شُتَيْرِ ابْنِ شَكَلٍ وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ اَنَّهُ كَانَ يَؤُمُّهُمْ فِي رَمَضَانَ بِعِشْرِيْنَ رَكْعَةً (آثار السنن، ج ۵۷)

شتیر ابن شکل سے مروی ہے (اور یہ حضرت علی رض کے اصحاب میں تھے) کہ وہ لوگوں کو رمضان المبارک میں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔

اوران کا پڑھانا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حکم سے تھا۔

(۲) قال ابنُ ابی شیبۃَ فی مُصَنَّفِہٖ حدّثنا وکیعٌ عن الحسنِ بنِ صالحٍ عن عمرِو بنِ قیسٍ عن ابی الحسناءِ انَّ علیاً امرَ رجلاً یُصلی بِھم فی رمضانَ عشرینَ رکعۃً (التعلیق الحسن ص ۵۷ ج ۲)

ابو الحسناء سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات پڑھائیں۔

(۳) اَخرجَ البیھقی عن ابی عبدِ الرحمٰنِ السُّلمی عن علیٍ رضی اللّٰہ عنہ قالَ دعا القُرّاءَ فی رمضانَ فامرَ منھم رجلاً یُصلّی بالناسِ عشرینَ رکعۃً قالَ وکانَ علیٌّ یُوتر بِھم وروی ذالک من وجہٍ اٰخرَ عن علیٍّ (آثار السنن ص ۵۶ ج ۱)

عبد الرحمان سلمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں قراء کو بلوایا اور ان میں سے ایک آدمی کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے (راوی کہتے ہیں) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو وتر پڑھایا کرتے تھے۔ اور یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔

روایت بیان کر کے امام بیہقی نے آخر میں یہ صراحت کر دی ہے کہ یہ روایت دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ اسی اثر سے امام ابن تیمیہؒ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ تراویح کو بعینہٖ باقی رکھا (منہاج السنۃ ص ۲۲۴ ج ۱) علامہ ابن تیمیہؒ کے اس استدلال پر المنتقیٰ میں حافظ ذہبی نے سکوت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو المنتقیٰ ص ۵۴۲) جو ان کے نزدیک صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

اہل مکہ کا بھی تعامل بیس رکعات پر تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

هٰكَذَا اَدْرَكْتُ بِبَلَدِ نَا بِمَكَّةَ يُصَلُّوْنَ عِشْرِيْنَ (تحفۃ الاحوذی ص ۷۶ ج ۲)
میں نے اپنے شہر مکہ میں یوں ہی پایا کہ لوگ بیس رکعات پڑھتے تھے۔

اب رہا عراق (کوفہ بصرہ) تو معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے بیس ۲۰ پر عمل تھا اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی بیس پڑھتے تھے۔

(ملاحظہ ہو تحفۃ الاحوذی ص ۷۶ ج ۲)

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس مسئلہ پر اجماع کے سلسلہ میں ابن حجرؒ کا یہ قول ملا علی قاری کے حوالے سے نقل کیا جا چکا کہ۔

اَجْمَعَ الصَّحَابَةُ عَلٰى اَنَّ التَّرَاوِيْحَ عِشْرُوْنَ رَكْعَةً (مرقاۃ ص ۱۹۴ ج ۳)
تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ تراویح کی بیس رکعات ہیں۔

ائمہ اربعہ بھی بیس ہی کے قائل ھیں

ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو مخالف موافق سب کو تسلیم ہے کہ وہ بیس ہی کے قائل ہیں امام محمد رحمۃ اللہ کی کتابوں سے لیکر اب تک احناف کی تمام کتابیں اس کی شاہد ہیں امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی بیس کے قائل ہیں۔

فقہ حنبلی کی کتاب المقنع میں ہے۔

ثُمَّ التَّرَاوِيْحُ وَهِيَ عِشْرُوْنَ رَكْعَةً يَقُوْمُ بِهَا فِيْ رَمَضَانَ فِيْ جَمَاعَةٍ
پھر تراویح اور یہ بیس رکعات ہے جسے رمضان میں جماعت کے ساتھ پڑھے۔

(المقنع ص ۱۸۳ ج ۱)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی بیس ہی رکعات پسند فرماتے ہیں۔ ان کا قول ہے۔

وَاَحَبُّ اِلَيَّ عِشْرُوْنَ رَكْعَةً (قیام اللیل ص ۹۲ بحوالہ رکعات تراویح ص ۸۹)
مجھے بیس ۲۰ ہی رکعات تراویح پسند ہیں۔

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا بھی ایک قول بیس ہی رکعات کا ہے۔ ابن رشد مالکیؒ بدایۃ المجتہد میں فرماتے ہیں۔

فَاخْتَارَ مالکٌ فِی اَحَدِ قَوْلَیْہِ وابُوْحَنِیْفَۃَ والشَّافِعِیُّ واحمدُ وَدَاوٗدُ الْقِیَامَ لِعِشْرِیْنَ رَکْعَۃً سِوَی الوِتْرِ (بدایۃ المجتہد ص ۱۹۲)	امام مالکؒ نے اپنے ایک قول کے اعتبار سے اور امام ابوحنیفہؒ امام شافعی امام احمد بن حنبلؒ اور داؤدؒ نے وتر کے علاوہ بیس رکعات کو اختیار کیا ہے۔

چھتیس۳۶، چالیس۴۰ اور اٹھائیس رکعات کی توجیہ

اور جو امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول مشہور ہے کہ ان نزدیک تراویح کی چھتیس رکعتیں ہیں جیسا کہ صاحب بدایۃ المجتہد نقل کرتے ہیں۔

وَذَکَرَ ابنُ القاسم عَنْ مالکٍ اَنَّہ کَانَ یَسْتَحْسِن سِتًّا وَعِشْرِیْنَ رَکْعَۃً والوِتْرَ ثَلَاثَ رَکْعَاتٍ (بدایۃ المجتہد ص ۱۹۲)	ابن القاسم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ چھتیس رکعات تراویح پسند کرتے تھے اور وتر تین رکعات۔

اسی طرح بعض سے چالیس اور بعض سے اٹھائیس رکعات منقول ہیں۔

ان سب کی توجیہ محققین نے یہ کی ہے کہ اہل مکہ ہر ترویحہ کے بعد سات طواف کیا کرتے تھے اور طواف کے بعد دو رکعت صلوٰۃ طواف پڑھتے تھے اور آخر میں طواف نہ کر کے دعا مانگتے تھے اس طرح یہ آٹھ رکعات زیادہ ہوگئیں اور مجازاً ان کو بھی تراویح میں شامل کر لیا گیا اس طرح تعداد اٹھائیس ہوگئی۔ اہل مدینہ نے چاہا کہ کثرتِ ثواب میں اہل مکہ کی ہمسری حاصل کریں چونکہ وہاں طواف کی شکل تھی نہیں تو اس کے بدلے میں ہر ترویحہ کے بعد چار رکعات کا اضافہ کر دیا اسی طرح یہ مزید سولہ رکعات بھی مجازاً تراویح میں شمار کی جانے لگیں اس طرح رکعات چھتیس ہوگئیں اور

بعض حضرات پانچویں ترویحہ کے بعد بھی چار رکعت مزید پڑھتے تھے اس بنا پر کل رکعات چالیس ہو گئیں۔ مُلّا علی قاری رح علامہ سیوطی رح سے نقل کرتے ہیں۔

وَذَكَرَ السُّيُوطِي فِي رِسَالَتِهِ اَنْ يُسْتَحَبَّ لِاَهْلِ المَدِينَةِ سِتًّا وَثَلٰثِيْنَ رَكْعَةً تَشْبِيْهًا بِاَهْلِ مَكَّةَ حَيْثُ كَانُوْا يَطُوْفُوْنَ بَيْنَ كُلِّ تَرْوِيْحَتَيْنِ طَوَافًا وَيُصَلُّوْنَ رَكْعَتَيْهِ وَلَا يَطُوْفُوْنَ بَعْدَ الخَامِسَةِ فَارَادَ اَهْلُ المَدِيْنَةِ مساواتهم فَجَعَلُوْا مَكَانَ كُلِّ طَوَافٍ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ (مرقاۃ ص ۱۹۳ ج ۳)

علامہ سیوطی رح نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ کے لئے چھتیس رکعات بہتر ہیں اہل مکہ کے ساتھ مشابہت اختیار کرتے ہوئے اس لئے کہ وہ لوگ ہر دو ترویحہ کے درمیان طواف کرتے اور طواف کی دو رکعت پڑھتے تھے۔ اور پانچویں کے بعد طواف نہیں کرتے تھے۔ تو اہل مدینہ نے ثواب میں ان کی برابری کا قصد کیا اور طواف کے بدلہ چار رکعت پڑھنے لگے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی اپنے فتاویٰ میں یہی توجیہ بیان فرمائی ہے۔ (ملاحظہ ہو فتاوی عزیزی ص ۱۲۰ ج ۱)

اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے گیارہ رکعات کا قول نقل کیا جاتا ہے امام مالک رح کی طرف اسکی نسبت ثابت نہیں ہے مذہب مالکیہ کی مستند اور مشہور کتب مثلاً "مدوّنہ کبری" "بدایۃ المجتہد" وغیرہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان تمام مباحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ (۱) بیس رکعات کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بے اصل نہیں ہے (۲) خلفائے ثلاثہ رض صحابہ کرام رض ائمہ مجتہدین سب کا بیس پر اجماع ہے (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آٹھ کی نسبت بے اصل ہے اس لئے آٹھ رکعات تراویح کا دعویٰ کرنا سنت رسول اللہ علیہ علیہ وسلم سنتِ خلفائے راشدین اور اجماع کی مخالف اور دلائل شرعیہ کو پامال کرنا ہے۔ اللھم احفظنا منہ۔

مسئلہ تراویح پر ایک اصولی گفتگو

مشہور حدیث شریف

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۱۷۳ ج ۱)	جس نے رمضان المبارک میں ایمان اور احتساب کے ساتھ نمازیں ادا کیں تو اسکے تمام گذشتہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے

اور اس سے قبل جو حدیثیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کی کثرت کے سلسلہ میں بیان کی گئیں۔ ان سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ رمضان المبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں جیسا کہ غیر مقلدین کے متفق علیہ عالم نواب صدیق صاحبؒ نے بھی اسکو تسلیم کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آٹھ رکعات تراویح کے سلسلہ میں جو حضرت جابرؓ کی روایت پیش کی جاتی ہے۔ اگر وہ ثابت بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ ایک رات کا واقعہ ہے جیسا کہ خود حدیث کے لفظ "صلی بنا" سے اسکی صراحت ہوتی ہے جبکہ یہ بات محقق ہے کہ تراویح باجماعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کم از کم تین دن یقیناً پڑھائی ہے اس کے برخلاف بیس رکعت پڑھانے کے سلسلہ میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کے الفاظ ہیں "کان یصلی بنا" ان الفاظ سے صراحت ہوتی ہے کہ یہ عمل کم از کم صرف ایک دن کا نہیں تھا بلکہ کئی دن ہوا۔ الحاصل رمضان المبارک میں عبادت کے سلسلہ میں آئی ہوئی صحیح اور متواتر احادیث نمازوں کی کثرت کی شہادت دیتی ہیں۔ اور آٹھ رکعت والی حدیث سے یہ معاملہ صرف ایک رات کا ثابت ہوتا ہے جبکہ بیس رکعات والی حدیث اس کثرت صلوٰۃ کی تائید کے ساتھ ساتھ اس کے تسلسل پر دلالت کرتی ہے پھر مزید برآں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے باقاعدہ اجراء

کی وجہ سے وہ سنت خلفاء میں بھی داخل ہو گئی ہے جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک مستقل دلیل شرعی ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الخ میں "سنۃ الخلفاء" کا "سنتی" پر عطف ہے اور قواعد نحویہ کی رو سے اصل عطف میں مُغایرت ہے کہ معطوف ، معطوف علیہ کا غیر ہونا چاہئے ۔ (ملاحظہ ہو مکتوب حضرت نانوتوی مندرجہ لطائف قاسمی ص ۔ او مکتوب حضرت گنگوہی ص ۱۵)

تو ثابت ہوا کہ جسطرح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دلیل اور واجب العمل ہے ۔ اسی طرح سے سنت خلفاء بھی مستقلاً دلیل اور واجب العمل ہے غیر مقلد حضرات کو اگر سنۃ خلفاء کا دلیل ہونا تسلیم نہیں ہے تو انہیں اپنے محقق اور مقتدا عالم نواب صدیق حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحقیق کو تو تسلیم کرنا چاہئے ۔ نواب صاحبؒ فرماتے ہیں

إنَّ مَا سَنَّهُ الخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ مِنْ بَعْدِهٖ فَالأَخْذُ بِهٖ لَيْسَ إِلَّا لِأَمْرِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم بِالأَخْذِ بِهٖ وَالاقْتِدَاءِ بِمَا فَعَلُوْهُ هُوَ لِأَمْرِهٖ صلی اللہ علیہ وسلم لَنَا بِالعَمَلِ بِسُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ (الدین الخالص ص ۳۵۴ ج ۲ بحوالہ الکلام المفید ص ۸۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو امور حضرات خلفائے راشدین نے جاری کیے ہیں ان کی ان امور میں پیروی اور اقتداء صرف اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ہمیں خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم دیا ۔

نواب صاحبؒ تسلیم کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین جو سنت جاری کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تو تراویح کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو سنت جاری فرمائی اسے اختیار کرنا چاہئے بالخصوص جبکہ جمہور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعامل اور اجماع بھی اسی کی موافقت کرتا ہے ۔

مسئلہ طلاق ثلٰثہ

مسئلہ تراویح کے بعد دوسرا اہم مسئلہ جس میں غیر مقلدین جمہور اہل سنت والجماعت سے اختلاف کرتے ہیں وہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ ہے۔ شریعت نے طلاق دینے کا بہتر طریقہ یہ تبلایا ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایک طلاق ایسے طہر میں دے جس میں اس نے بیوی سے مباشرت نہ کی ہو۔ پھر عدت گذر جانے کے بعد عورت جُدا ہو جائے گی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

فَاِنْ اَرَادَ اَنْ یُطَلِّقَهَا فَلْیُطَلِّقْهَا حِیْنَ تَطْهُرَ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُجَامِعَهَا (مسلم شریف ص ۴۷۶ ج ۱)	پھر اگر طلاق دینے کا ارادہ کرے تو اسے طلاق طہر کی حالت میں دے جبکہ اس سے مباشرت نہ کی ہو۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اگر طلاق کی ضرورت پیش آتی تو ان کا عمومی اور پسندیدہ عمل یہی تھا۔

رُوِیَ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ النَّخَعِیِّ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَیْهِ اَنَّهُ قَالَ کَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَسْتَحْسِنُوْنَ اَنْ لَا یُطَلِّقُوْنَ لِلسُّنَّةِ اِلَّا وَاحِدَةً ثُمَّ لَا یُطَلِّقُوْنَ ذَالِكَ حَتّٰی تَنْقَضِیَ الْعِدَّةُ (اخرجه ابن ابی شیبة فی مصنفه)	ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پسند کرتے تھے کہ بطور سنت ایک ہی طلاق دی جائے۔ پھر اس کے بعد کوئی طلاق نہ دیں یہانتک کہ عدت گذر جائے۔

اگر کوئی شخص مکمل تین ہی طلاق دینا چاہتا ہے تو اس کی بہتر شکل یہ ہے کہ تینوں طلاقوں کو تین طہروں میں مکمل کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَنْ تَسْتَقْبِلَ الطُّهْرَ اِسْتِقْبَالًا فَتُطَلِّقَهَا لِكُلِّ طُهْرٍ تَطْلِيقَةً

تم طہر کا بطور خاص انتظار کرو پھر ہر طہر میں ایک طلاق دو۔

(بدائع ص ۸۹ ج ۳ وروی مثلہ الدارقطنی والطبرانی کما فی الدرایہ ص ۳۵۵ ج ۲ علی ھامش الھدایۃ۔

لیکن اگر کوئی شخص طریقہ سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ہی مجلس میں تینوں طلاقیں دے ڈالے تو باوجودیکہ اس کا یہ عمل شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور قابل مواخذہ ہے پھر بھی یہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

وَاِنْ كُنْتَ طَلَّقْتَهَا ثَلَاثًا فَقَدْ حَرُمَتْ عَلَيْكَ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَكَ وَعَصَيْتَ اللّٰهَ فِيْمَا اَمَرَكَ مِنْ طَلَاقِ اِمْرَأَتِكَ

(صحیح مسلم ص ۴۷۶ ج ۱)

اگر تم نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ تم پر حرام ہو جائے گی یہانتک کہ وہ دوسرے شوہر سے تعلق زوجیت قائم کرے۔ اور تم اپنی بیوی کے طلاق کے سلسلہ میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کروگے۔

بالکل ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول مجلس واحد کی تین طلاقوں کے سلسلہ میں ہے کیونکہ اگر تین طلاقیں تین طہر میں دی جائیں تو اسکی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت عنایت فرمائی ہے جیسا کہ دارقطنی طبرانی وغیرہ کے حوالہ سے حدیث گذر چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے باوجود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اُسے معصیت قرار دینا امر محال ہے۔ اس لئے یہ بات بالکل طے ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے معصیت ہونے کے باوجود جن کے نافذ ہونے کا مسئلہ بیان فرمایا ہے وہ مجلس واحد ہی کی تین طلاقیں ہیں۔ جمہور صحابہ کرام۔ تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین کا یہی مسلک ہے۔ محقق

ابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ فرماتے ہیں۔

وَذَهَبَ جُمْهُوْرُ الصحابةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنْ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى اَنَّهٗ يَقَعُ الثَّلَاثُ

جمہور صحابہ کرام رضؓ تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

(فتح القدیر ص ۳۳۰ ج ۳)

شارح مسلم علامہ نووی رحؒ المتوفی ۶۷۶ھ فرماتے ہیں۔

فَقَالَ الشَّافِعِيُّ ومالِكٌ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ واحمدُ وَجَمَاهِيْرُ مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ يَقَعُ الثَّلَاثُ۔

تو امام شافعی رحؒ امام مالکؒ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبلؒ اور تمام متقدمین اور متاخرین کا قول ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

علامہ بدرالدین العینی شارح بخاری المتوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں۔

وَمَذْهَبُ جَمَاهِيْرِ الْعُلَمَاءِ من التابعِيْنَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ مِنْهُمُ الْاَوْزَاعِيُّ وَالنَّخْعِيُّ وَالثَّوْرِيُّ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ وَمَالِكٌ وَاَصْحَابُهٗ وَالشَّافِعِيُّ وَاَصْحَابُهٗ وَاَحْمَدُ وَ اَصْحَابُهٗ وَاِسْحَاقُ وَاَبُوْثَوْرٍ وَاَبُوْ عُبَيْدٍ وَآخَرُوْنَ كَثِيْرُوْنَ عَلٰى مَنْ طَلَّقَ اِمْرَأَتَهٗ ثَلَاثًا وَقَعْنَ وَلٰكِنَّهٗ يَأْثَمُ وَقَالُوْا مَنْ خَالَفَ فِيْهِ فَهُوَ شَاذٌّ مُخَالِفٌ لِاَهْلِ السُّنَّةِ

تابعین اور ان کے بعد کے تمام علماء جن میں امام اوزاعی امام نخعی امام ثوری امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب امام مالک اور ان کے اصحاب امام شافعی اور ان کے اصحاب امام احمد اور ان کے اصحاب امام اسحاق امام ابوثور امام ابوعبید اور ان کے علاوہ بہت سارے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو سب واقع ہو جائیں گی۔ البتہ وہ شخص

وَانَّمَا تَعَلَّقَ بِهٖ اَهْلُ الْبِدَعِ وَمَنْ لَا یُلْتَفَتُ اِلَیْهِ لِشُذُوْذِهٖ مِنَ الْجَمَاعَةِ (عمدۃ القاری ص ۵۲۷ ج ۹)

گناہ گار ہوگا اور جمہور کہتے ہیں جو شخص اس سلسلہ میں اختلاف کرتا ہے تو وہ متفرد اور اہل سنت والجماعت کا مخالف ہے اور اس مخالفت سے تو اہل بدعت اور وہ لوگ وابستہ ہیں جو جماعت مسلمین سے منحرف ہوجانے کی وجہ سے ناقابل التفات ہیں۔

محقق ابن الہمام رح علامہ نووی رح علامہ عینی رح کے علاوہ بے شمار علمائے کرام نے جمہور امت کے اس مسئلہ پر اجماع اور اتفاق کی صراحت کی ہے۔ بغرض اختصار صرف انہیں تین حضرات کی عبارتوں پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ اس اجماع اور اتفاق کے برخلاف متقدمین میں سے دو ایک اور متاخرین میں علامہ ابن تیمیہ رح المتوفی ۷۲۸ھ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم رح المتوفی ۷۵۱ھ اور موجودہ دور میں غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی ہوں گی اب ہم اختصار کے ساتھ طرفین کے کچھ دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ مسائل دینیہ کو دلائل کی روشنی میں سمجھنے والوں کے لئے شرح صدر اور اطمینان کلی کا سامان فراہم ہو۔

جمہور امت کے دلائل

پہلی دلیل۔ اس مسئلہ کی سب سے بنیادی دلیل قرآن کریم کی "آیت طلاق" الطلاق مرتان الخ (البقرہ) ہے۔ کتب تفسیر میں آیت مذکورہ کے دو شان نزول بیان کئے گئے ہیں۔ ایک شان نزول وہ ہے جو بیہقی رح اور ابن مردویہ رح نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمْ یَکُنْ لِلطَّلَاقِ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔

وَقْتٌ يُطَلِّقُ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ ثُمَّ يُرَاجِعُهَا مَا لَمْ تَنْقَضِ الْعِدَّةُ فَوَقَّتَ لَهُمُ الطَّلَاقَ ثَلَاثًا يُرَاجِعُهَا فِي الْوَاحِدَةِ وَالثِّنْتَيْنِ وَلَيْسَ فِي الثَّالِثَةِ رَجْعَةٌ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ۔
(تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

پہلے طلاق کی کوئی تحدید نہیں تھی۔ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا رہتا تھا اور عدت گذرنے سے قبل رجوع کر لیا کرتا تھا۔ تو ان کے لئے تین طلاقیں متعین کر دی گئیں۔ ایک اور دو طلاق میں تو شوہر اپنی بیوی سے رجعت کر سکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد رجعت نہیں ہے یہاں تک وہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔

امام طبری رح اپنی تفسیر میں اسی شان نزول کی روشنی میں لکھتے ہیں

فَتَأْوِيلُ الْآيَةِ عَلَى هَذَا الْخَبَرِ الَّذِي ذَكَرْنَا عَدَدُ الطَّلَاقِ الَّذِي لَكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ فِيهِ عَلَى أَزْوَاجِكُمُ الرَّجْعَةُ إِذَا كُنَّ مَدْخُولًا بِهِنَّ تَطْلِيقَتَانِ ثُمَّ الْوَاجِبُ بَعْدَ التَّطْلِيقَتَيْنِ إِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ لِأَنَّهُ لَا رَجْعَةَ لَهُ بَعْدَ التَّطْلِيقَتَيْنِ إِنْ سَرَّحَهَا فَطَلَّقَهَا الثَّالِثَةَ
(تفسیر طبری ص ۲۵۸ ج ۳)

تو آیت کی تفسیر اس شان نزول کے اعتبار سے جس کو ہم نے ذکر کیا یہ ہے کہ اس طلاق کی تعداد جس میں تمہیں اے مردو اپنی مطلقہ بیویوں پر رجعت کا حق ہے۔ جبکہ ان سے ہم بستری ہو چکی ہو۔ دو طلاقیں ہیں۔ ان دو طلاقوں کے بعد خوش اسلوبی کے ساتھ نکاح میں روک لینا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اس لئے کہ دو طلاقوں کے بعد اگر چھوڑنا چاہے اور تیسری طلاق دیدے تو پھر رجعت نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی بیویوں کو جتنی چاہتے طلاقیں دیدیتے تھے اور عدت گذرنے سے پہلے رجعت کر لیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ کے ذریعہ طریقۂ جاہلیت کو ختم کر کے طلاق اور رجعت کے حدود متعین فرما دیئے کہ طلاق

کی تعداد صرف تین تک ہے اور رجعت فقط دو طلاقوں تک ممکن ہے آیت کریمہ کا دوسرا شان نزول بیان کرتے ہوئے علامہ طبری رح فرماتے ہیں۔

وَقَالَ الْآخَرُوْنَ اِنَّمَا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ عَلٰى نَبِيِّ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم تَعْرِيْفًا مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى ذِكْرُهُ عِبَادَهُ سُنَّةَ طَلَاقِهِمْ نِسَاءَهُمْ إِذَا أَرَادُوْا طَلَاقَهُنَّ لَا دَلَالَةَ عَلَى الْقَدْرِ الَّذِيْ تَبِيْنُ بِهِ الْمَرْأَةُ مِنْ زَوْجِهَا وَتَاوِيْلُ الْآيَةِ عَلٰى قَوْلِ هٰؤُلَاءِ سُنَّةُ الطَّلَاقِ الَّتِيْ سَنَنْتُهَا وَأَبَحْتُهَا لَكُمْ اِنْ أَرَدْتُمْ طَلَاقَ نِسَائِكُمْ أَنْ تُطَلِّقُوْهُنَّ ثِنْتَيْنِ فِيْ كُلِّ طُهْرٍ وَاحِدَةً ثُمَّ الْوَاجِبُ بَعْدَ ذَالِكَ عَلَيْكُمْ إِمَّا أَنْ تُمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تُسَرِّحُوْهُنَّ بِإِحْسَانٍ

(تفسیر طبری ص ۲۵۹ ج ۳)

دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف اپنے بندوں کو ان کی بیویوں کے طلاق کا پسندیدہ طریقہ سکھلانے کے لئے نازل ہوئی اگر وہ طلاق کا قصد رکھتے ہوں آیت کا مقصد اس مقدار ——— طلاق کو بیان کرنا نہیں ہے جس کے بعد بیوی جدا ہو جاتی ہے ان حضرات کے قول کے اعتبار سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کا وہ طریقہ جسکو میں نے تمہارے لئے جاری اور مباح کیا یہ ہے کہ جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینی چاہو تو انہیں دو طلاق دو طہروں میں دو پھر تم پر واجب ہے کہ انہیں اچھے طریقہ سے روک لو یا عمدہ طریقہ سے چھوڑ دو۔

الحاصل شان نزول کے اعتبار سے آیت کی دو تفسیریں ہوئیں۔

(۱) آیت میں طلاق کی تعداد اور آخری طلاق کی حد بیان کی گئی ہے۔

(۲) آیت میں طلاق دینے کا شرعی طریقہ تبلایا گیا ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں۔ مجاہد کی یہی رائے ہے امام ابن جریر طبری رح حافظ ابن کثیر رح امام رازی رح وغیرہ نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے علامہ سید آلوسی رح نے اسی کو

"الیق بالنظم واوفق بسبب النزول (روح المعانی ص ۱۳۵ ج ۲) نظم آیات اور شان نزول کے مطابق قرار دیا ہے صاحب تفسیر مظہری بھی اسی کے مؤید ہیں۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)۔ پہلی تفسیر کے اعتبار سے "مرتان" کے معنی "ثنتان" اور "عددان" ہوں گے یعنی قابل رجعت طلاقیں دو ہیں یہ عام ہے کہ وہ دونوں طلاقیں

۱۔ ایک ہی مجلس میں ہوں۔

۲۔ یا الگ الگ طہر میں ہوں۔ دوسری تفسیر کے اعتبار سے "مرتان" کا معنی مرۃً بعد مرۃٍ ہوگا صاحب مدارک التنزیل فرماتے ہیں۔

وَلَمْ يُرِدْ بِالْمَرَّتَيْنِ التَّثْنِيَةَ وَلٰكِنَّ التَّكْرِيْرَ (مدارک التنزیل ص ۱۱۵ ج ۱)

"مرتان" سے تثنیہ نہیں بلکہ تکرار مراد ہے۔

اب اس صورت میں تفسیر یہ ہوگی کہ طلاق کی پسندیدہ شکل یہ ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَالْمَعْنٰى اَنَّ التَّطْلِيْقَ الشَّرْعِيَّ تَطْلِيْقَةٌ بَعْدَ تَطْلِيْقَةٍ عَلَى التَّفْرِيْقِ فِي الْاَطْهَارِ دُوْنَ الْجَمْعِ

(تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)

معنی یہ ہے کہ شرعی طلاق یکے بعد دیگر الگ الگ طہروں میں طلاق دینا ہے نہ کہ طلاقوں کو جمع کرنا۔

آیت سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی پسندیدہ طلاق یہی ہے کہ وہ الگ الگ طہروں میں دی جائیں۔ لیکن اس تفسیر کی رو سے بھی آیت سے یہ مطلب اخذ کرنا ہرگز درست نہیں ہے کہ ایک ہی طہر میں اگر طلاقیں جمع کر دی جائیں تو وہ نافذ ہی نہیں ہوں گی۔ ان کے نفس طلاق ہونے سے انکار ثابت کرنا آیت سے کسی بھی طرح ممکن نہیں ہاں انہیں مرضی الٰہی اور طریقہ شریعت کے خلاف کہا جائے گا۔ لیکن حقیقت طلاق کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔

آیت زیر بحث میں "الطلاق مرتان" کے بعد چند طلاق ہی سے متعلق مسائل بیان کرکے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ الخ

اگر شوہر نے تیسری طلاق دیدی تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی جبتک کہ دوسرے شوہر سے تعلقِ زوجیت قائم نہ کرلے۔

اس آیت میں تیسری طلاق کا تذکرہ ہے۔ اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ دونوں طلاقیں بیک وقت دیدینا باوجود ناپسندیدہ ہونے کے وقوع سے مانع نہیں ہے بعینہٖ یہی شکل تینوں طلاقیں بیک وقت دیدینے کی ہے کہ وہ بدعت اور باعث گناہ ہونے کے باوجود واقع ہوجاتی ہیں قاضی ثناء اللہ صاحبؒ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَعَلٰی كِلَا التَّاوِيْلَيْنِ يَظْهَرُ اَنَّ جَمْعَ الطَّلْقَتَيْنِ اَوْ ثَلَاثِ تَطْلِيْقَاتٍ بِلَفْظٍ وَاحِدٍ اَوْ بِاَلْفَاظٍ مُخْتَلِفَةٍ فِيْ طُهْرٍ وَاحِدٍ حَرَامٌ وَبِدْعَةٌ وَهُوَ خِلَافًا لِلشَّافِعِيِّ فَاِنَّهٗ يَقُوْلُ لَا بَأْسَ بِهٖ لٰكِنَّهُمْ اَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّهٗ مَنْ قَالَ لِاِمْرَأَتِهٖ انت طالقٌ ثلاثًا يَقَعُ ثَلَاثًا بِالْاِجْمَاعِ

(تفسیر مظہری ص ۳۰۰ ج ۱)

اور آیت کی دونوں تاویلوں کے مطابق یہ بات ظاہر ہے کہ دو یا تین طلاقوں کو جمع کرنا خواہ ایک ہی لفظ سے یا الگ الگ الفاظ سے حرام بدعت اور باعث گناہ ہے امام شافعیؒ اس مسئلہ میں اختلاف فرماتے ہیں ان کے نزدیک جمع کردینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ جس شخص نے اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا کہ تمہیں تین طلاقیں ہیں تو یہ تینوں بالاجماع واقع ہوجائیں گی۔

علامہ ابن حزمؒ فان طلقها فلا تحل له الخ کے تحت لکھتے ہیں۔

فَهٰذَا يَقَعُ عَلَى الثَّلَاثِ مَجْمُوعَةً وَمُفَرَّقَةً وَلَا يَجُوزُ اَنْ يَخُصَّ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ بَعْضَ ذٰالِكَ دُوْنَ بَعْضٍ بِغَيْرِ نَصٍّ
(المحلی ص ۲۰۷ ج ۱۰)

یہ آیت ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتی ہے جو بیک وقت دی گئی ہوں اور ان طلاقوں پر بھی جو الگ الگ دی گئی ہوں اور بغیر کسی نص کے آیت کو کسی ایک ہی شکل کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ہے

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں باب قائم کیا ہے " باب من اجاز الطلاق الثلث ،، علامہ عینیؒ علامہ ابن الحجرؒ علامہ کرمانیؒ علامہ سندھیؒ وغیرہ شراح بخاری اس پر متفق ہیں کہ امام بخاری کی مراد یہاں طلاق ثلث سے عام ہے کہ وہ دفعۃً ہوں یا الگ الگ ہوں۔

(ملاحظہ ہو حاشیۂ بخاری ۲ ۷ وحاشیۂ سندھی ص ۱۹۱ ج ۲)

امام بخاری اپنے اس باب پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی آیتِ مذکورہ دونوں شکلوں کو شامل ہے۔

(۲) **دوسری دلیل**:۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے اسی باب میں پہلی حدیث حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ کے طلاق اور لعان کے واقعہ کے سلسلہ میں بیان کی ہے کہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کر لینے کے بعد اسی وقت تین طلاقیں دیدیں

حدیث کے الفاظ ہیں۔

فطلقها ثلاثا قبل ان یامرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
(بخاری شریف ص ۱۹۱ ج ۲ و مسلم شریف ص ۴۸۹ ج ۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم دینے سے پہلے ہی انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں۔

انہوں نے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی تین طلاقیں دیدیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی انکار نہیں فرمایا۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ولم ینکر علیہ اطلاق لفظ الثلاث — حضور صلی اللہ علیہ وسلم لفظ تین کے بولنے پر انکار نہیں فرمایا۔

(شرح مسلم ص ۴۸۹ ج ۱)

بلکہ ابو داؤد کی روایت میں تو اس بات کی صراحت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں طلاقوں کو نافذ فرما دیا تھا۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔

فَطَلَّقَهَا ثَلٰثَ تطلیقاتٍ عندَ رسولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَنْفَذَہٗ رسولُ اللّٰہِ صلّی اللہ علیہ وسلم — انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی تین طلاقیں دیدیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو نافذ فرما دیا۔

(ابو داؤد ص ۳۰۷ ج ۱)

اس موقع پر یہ بحث اٹھانا کہ لعان کی وجہ سے فرقت واقع ہو گئی تھی اور وہ عورت محل طلاق ہی نہیں رہ گئی تھی اس لئے حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا۔ روایتِ ابو داؤد کی اس صراحت کے بعد بے محل ہے۔

تیسری دلیل:۔

عَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِیْدٍ قَالَ اُخْبِرَ رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ رجلٍ طَلَّقَ اِمْرَأتَہٗ ثَلَاثَ تَطْلِیْقَاتٍ جَمِیْعًا فَقَامَ غَضْبَانًا ثُمَّ قَالَ اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَاَنَا بَیْنَ اَظْہُرِکُمْ حَتّٰی قَامَ رَجُلٌ وَقَالَ — محمود ابن لبید رضؓ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ سے کھڑے ہو گئے پھر ارشاد فرمایا میرے۔ تمہارے درمیان ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل

یارسولَ اللّٰہِ اَلَا اَقْتُلُہٗ ۔
(نسائی شریف ص ۳۶ ج ۲)

کیا جارہا ہے یہانتک کہ ایک صاحب کھڑے ہوکر کہنے لگے یارسول اللہ کیا میں اسے قتل نہ کردوں ۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

وَرُوَاتُہٗ مُوَثَّقُوْنَ ۔
(بلوغ المرام ص ۱۳۵)

اس حدیث کے تمام راوی ثقات میں سے ہیں ۔

یہ طلاق دینا یقیناً طریقہ شریعت کے خلاف تھا اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم برہم ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رد نہیں فرمایا بلکہ نافذ فرمادیا ۔ مشہور محدث قاضی ابو بکر ابن العربی فرماتے ہیں ۔

فَلَمْ یَرُدَّہٗ النبیُّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّمَ بَلْ اَمْضَاہُ کما فِی حدیثِ عُوَیْمِرِ العَجلانی فِی اللِّعان حیثُ اَمْضَی طَلَاقَہٗ الثّلٰث ۔
(تہذیب سنن ابی داؤد ص ۱۲۹ ج ۳ بحوالہ عمدۃ الاثاث ص ۲۹)

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تینے طلاقوں کو رد نہیں کیا بلکہ نافذ کردیا جیسا کہ عویمر عجلانی کی لعان والی حدیث میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تین طلاقوں کو نافذ فرمادیا تھا ۔

چوتھی دلیل :۔

عن ابراھیم عن داؤد بن عبادۃ بن الصامت قال طلق جدّی امرأۃ لہ الف تطلیقۃٍ فانْطلقَ اَبِی الی رسولِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فذکرلہٗ ذالکَ فقال

ابراہیم روایت کرتے ہیں داؤد ابن عبادۃ ابن صامت سے کہ انہوں نے کہا کہ میرے دادا نے اپنی ایک بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں میرے باپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ

النبیُ صلی اللہ علیہ وسلم اَمَّا اِتَّقَی اللّٰہ جدُّكَ اَمَّا ثلثٌ فله وامّا تسعُ مائةٍ وسبعةٌ وتسعونَ فعُدوانٌ وظلمٌ اِن شاء اللّٰہُ عذّبه واِن شاء غفرَ لهٗ۔
(مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۳ ج ۶)

بیان کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہارے والد اللہ سے نہیں ڈرے۔ بہرحال تین طلاق تو ان کا حق تھا۔ رہیں بقیہ نوسو ستانوے طلاقیں تو وہ ظلم و زیادتی ہیں۔ اللہ چاہے تو سزا دیں اور چاہیں تو انہیں معاف کر دیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ہزار طلاقیں بیک وقت ہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے تین کو نافذ فرما دیا۔ عہدِ نبوت میں جس کو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون فرمایا ہے بہت تلاش و جستجو کے بعد بیک مجلس تینوں طلاقیں دینے کی صرف یہی تین مثالیں مل سکیں اور ان تینوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نافذ فرما دیا۔ مزید تلاش پر شاید ایک دو مثالیں اور مل جائیں لیکن اتنا مسلم ہے کہ اس پاک معاشرے میں بیک مجلس تینوں طلاقیں دینے کا ان شاذ و نادر واقعات سے قطع نظر کر کے عموماً رواج ہی نہیں تھا۔ صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

كَانَ الطلاقُ علىٰ عَهْدِ رسولِ اللّٰہ صلّی اللہ علیہ وسلم واَبی بکرٍ وسَنَتَيْنِ مِنْ خِلافةِ عمر طلاقُ الثلاثِ واحدةً۔
(صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱ و مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۲ ج ۶)

طلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دو سال تک تین طلاق دینا ایک تھا۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں نیز حضرت عمر کی

خلافت کے ابتدائی ایام تک لوگ تین طلاق دینے کے بجائے صرف ایک ہی طلاق دیتے تھے۔ دوسری حدیث کے الفاظ ہیں۔

فَلَمَّا کَانَ فِیْ عَہْدِ عُمَرَ تَتَابَعَ النَّاسُ فِی الطَّلَاقِ　　جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ پے درپے طلاق دینے لگے۔

(صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱)

ثابت ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں تین طلاقیں بیک وقت دینے کا معاملہ اِکّا دُکّا تھا لیکن سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا زمانہ آتے آتے لوگوں کی کیفیت وہ نہ رہی۔ اب طلاق کے معاملہ میں بے احتیاطیاں عام ہونے لگیں۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے کے معاملات بکثرت وقوع پذیر ہونے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مشورے سے ان تینوں طلاقوں کو نافذ کر دیا اور اس پر تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہوگیا۔ اس دور کے تمام اہل اسلام نے کلیۃً اسے تسلیم کر لیا۔ اس کی مخالفت میں کوئی ادنیٰ سی بھی آواز نہیں اُٹھی۔ کیونکہ یہ اجماع کسی نئے مسئلہ کا اجماع نہ تھا کہ بحث وتفحص یا از سرِ نو غور وفکر کی صورت ہوتی۔ بلکہ یہ تو وہ مسئلہ تھا کہ خود زمانہ رسالت میں بھی پیش آچکا تھا اور اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ بھی فرما چکے تھے جیسا کہ عویمر عجلانی رضؓ اور محمود بن لبید رحؒ وغیرہ کی روایتؓ سے ثابت ہے فرق محض اتنا تھا کہ پہلے یہ شکل قلیل الوقوع اور نادر تھی اور اب اس کا وقوع بکثرت ہونے لگا تھا اجماع کا مقصد صرف اتنا تھا کہ آیت کریمہ "الطلاق مرتان" کی دوسری تفسیر "مرۃً بعد مرۃٍ" کی رو سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ بیک دفعہ دی گئی طلاقیں شاید واقع نہ ہوں اب اس اجماع کی وجہ سے یہ خلش لوگوں کے ذہنوں سے دور ہو جائے اور مسئلہ کی صحیح صورت فیصلۂ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں از سر نو ذہن نشین ہو جائے۔

امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی رح فرماتے ہیں۔

فَخَاطَبَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ بِذَالِكَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَفِیْھِمْ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ وَرَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمُ الَّذِیْنَ قَدْ عَلِمُوْا مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَالِكَ فِیْ زَمَنِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ فَلَمْ یُنْکِرْہُ عَلَیْہِ مِنْھُمْ وَلَمْ یَدْفَعْہُ دافع (شرح معانی الآثار ص ۲۹ ج ۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں سے اس بارے میں خطاب فرمایا اور ان میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رض بھی تھے جو بخوبی جانتے تھے کہ اس سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کے متعلق کیا ہوتا رہا؟ لیکن ان میں سے نہ کسی نے اس فیصلہ کا انکار کیا اور نہ کسی نے ٹال مٹول کی۔

مخالفین کے دلائل

وہ حضرات جو ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک ہی مانتے ہیں اپنے نظریہ کی تائید میں جو دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے دو دلیلیں ان کے نزدیک نہایت وقیع ہیں اس موقع پر علی الترتیب وہ دونوں دلیلیں اور ساتھ ساتھ ان کے جوابات بیان کیے جا رہے ہیں تاکہ حقیقت مسئلہ اپنے دلائل کی مضبوطی اور دلائل مخالف کی کمزوری دونوں پہلوؤں سے سامنے آسکے۔

پہلی دلیل:۔ اس سلسلہ میں یہ حضرات اپنی سب سے مضبوط دلیل جس پر انہیں بڑا ناز بھی ہے صحیح مسلم وغیرہ کی اس روایت کو سمجھتے ہیں۔

عن ابن طاؤس عن ابیہ عن ابن عباسؓ قال کان الطلاق علی عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکرؓ وسنتین من خلافۃ عمرؓ طلاق الثلاث واحدۃ فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فی امر کانت لہم فیہ اناۃ فلو امضیناہ علیہم فامضاہ علیہم۔ (صحیح مسلم ص ۴۷۷ ج ۱ و مصنف عبدالرزاق ص ۳۹۲ ج ۱ و مسند امام احمد ص ۲۵۰ ج ۱)

ابن طاؤس اپنے باپ طاؤس سے وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ طلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور ابوبکرؓ کے زمانے میں اور عمرؓ کی خلافت کے دو سال تک تین طلاق دینا۔ ایک تھا۔ پس حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب لوگوں نے اس کام میں جلدی کی جس میں ان کو ٹھہر ٹھہر کر کرنے کا حکم تھا تو ایسا ہو تاکہ ہم اس کو ان کے اوپر نافذ کر دیتے پس حضرت عمرؓ ان کو ان کے اوپر نافذ کر دیا۔

اس حدیث کا مطلب یہ حضرات یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں اور عہد صدیقی میں اور خلافت فاروقی کے ابتدائی دو سالوں میں لوگ تین طلاقیں دیا کرتے تھے مگر انہیں ایک ہی قرار دیا جاتا تھا۔ حدیث کا یہ مطلب بیان کرنا سراسر غلط اور الفاظ حدیث پر صحیح غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے خود اسی حدیث کے آخری جملے اس کی تکذیب کرتے ہیں حدیث کے الفاظ ہیں۔

قد استعجلوا الخ لوگوں نے اب جلد بازی شروع کر دی ہے گویا پہلے یہ دستور نہ تھا جبکہ یہ حضرات کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی زمانے میں یہی دستور تھا جس سے یہ لازم آتا ہے کہ حدیث کی ابتداء اور انتہا میں (معاذ اللہ) تضاد ہے۔ نیز حدیث میں "طلاق الثلاث" کا لفظ ہے یہ صفت موصوف کی نہیں بلکہ اضافت

کی ترکیب ہے جس کا ترجمہ "تین طلاق" کرنا ہرگز درست نہیں بلکہ اس کا صحیح ترجمہ تین طلاقوں کی طلاق یعنی تین طلاق دینے کے بجائے صرف ایک طلاق دیتے تھے۔
(ملاحظہ ہو تحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمان محدث اعظمی مطبوعہ المآثر ص ۱۹ شمارہ ۲ ج ۲)

حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس میں طلاق کی تاریخ بیان کی جارہی ہے کہ عہد نبوی سے لیکر ابتدائے عہد فاروقی تک لوگ یکجا تین طلاقیں دینے کے بجائے ایک ایک طہر میں ایک ایک طلاق دیا کرتے تھے خلافت فاروقی کے تیسرے سال سے لوگوں نے جلد بازی شروع کر دی تو وہ تینوں طلاقیں نافذ کر دی گئیں۔ حدیث میں تغیر مسئلہ نہیں بلکہ لوگوں کی عادت کے تغیر کو تبلایا گیا ہے۔

محقق نووی رح فرماتے ہیں۔

المرادُ ان المعتادَ فی الزمنِ الاولِ کانَ طلقۃً واحدۃً وصار الناس فی زمنِ عُمَرَ یُوقعُونَ الثلاثَ دَفعۃً فنفذَہٗ فعلیٰ ھذا یکونُ اِخبارًا عن اختلافِ عادۃِ الناسِ لاعَنْ تغیرِ حکمٍ فی مسئلۃٍ واحدۃٍ۔

مراد یہ ہے کہ پہلے ایک طلاق کا دستور تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ تینوں طلاقیں بیک وقت دینے لگے تو حضرت عمر رض نے انہیں نافذ کیا تو اسطور پر یہ حدیث لوگوں کی عادتوں کے بدل جانے کی خبر ہے نہ کہ مسئلہ واحدہ میں حکم کے بدلنے کی اطلاع ہے۔

(نووی شرح مسلم ص ۴۷۸ ج ۱)

محدث ابوزرعہ الرزاق کی تحقیق ہے

معنی ھذ الحدیثِ عندی اَن ما تُطَلِّقُونَ اَنتُم ثلاثًا کانوا یُطَلِّقُونَ واحدۃً فی زمنِ

اس حدیث کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ جیسے اب تم تین طلاقیں دیا کرتے ہو حضرات صحابہ رض وغیرہ حضور صلی اللہ

النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابی بکر وعمر رض (سنن کبریٰ ص ۳۳۸ ج ۷)

علیہ وسلم کے زمانہ اور حضرت ابوبکر رض اور حضرت عمر رض کے زمانہ میں صرف ایک ہی دیا کرتے تھے۔

چنانچہ صحیح سند کے ساتھ کوئی ایک واقعہ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا حضرت ابوبکر رض نے یا حضرت عمر رض نے ابتدائے خلافت میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا ہو۔ اس حدیث کے سلسلہ میں اور بھی تحقیقات محققین نے بیان کی ہیں لبغرض اختصار انہیں یہاں بیان نہیں کیا جا رہا ہے مزید تفصیل کے لئے علامہ نووی کی شرح مسلم۔ فتح الباری وغیرہ ملاحظہ ہو۔

دوسری دلیل:۔ مسند احمد کی اس روایت سے پیش کرتے ہیں۔

حدثنا عبدُ اللهِ حدثنی ابی ثنا سَعدُ ابن ابراهیمَ ثنا ابی عن محمدِ بنِ اسحٰقَ حدثنی داودُ بنُ الحُصَینِ عن عکرمةَ مولی ابنِ عباسٍ عن ابن عباسٍ رض قال طَلَّقَ رکانةُ بنُ عبدِ یزیدَ اخو بنی مطلبٍ امرأتَه ثلاثًا فی مجلسٍ واحدٍ فحَزِنَ علیها حُزنًا شدیدًا قال فسألَه رسولُ اللهِ صلی الله علیه وسلم "کیف طلّقتَها؟" قال طلّقتُها ثلاثًا قال، فقال "فی مجلسٍ واحدٍ" قال

ہم سے حدیث بیان کی عبد اللہ نے انہوں نے کہا مجھ سے روایت بیان کی میرے والد نے انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی سعد ابن ابراہیم نے انہوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کی میرے والد نے محمد ابن اسحٰق سے انہوں نے کہا مجھ سے حدیث بیان کی داود ابن حصین نے عکرمہ مولی ابن عباس رض سے انہوں نے روایت کی ابن عباس رض سے انہوں نے کہا رکانہ بن عبد یزید مُطّلبی نے ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں پھر اسکی مفارقت پر انہیں شدید صدمہ ہوا۔ ابن عباس نے کہا پھر ان سے رسول اللہ

نَعَمْ قَالَ" فَاِنَّمَا تِلْكَ وَاحِدَةٌ فَارْجِعْهَا اِنْ شِئْتَ" قَالَ: فَرَجَعَهَا۔ (المحصل من مسند الامام احمد بن حنبل ص ۲۵۰ ج ۱۱)

صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ تم نے اسے کیسے طلاق دی۔ انہوں نے کہا میں نے اسے تین طلاقیں دیدیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک ہی مجلس میں انہوں نے ہاں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تو فقط ایک ہی ہوئی اگر چاہو تو عورت سے رجوع کرلو۔ ابن عباس کہتے اس پر انہوں نے عورت سے رجوع کرلیا۔

سنن ابوداؤد میں ابن جریج کی روایت ہے کہ ابو رکانہ رضؓ نے ام رکانہ کو تین طلاق دی تھی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے رجوع کرلیا۔

(ابوداؤد ص ۲۹۸ ج ۱)

یہ حضرات کہتے ہیں اس روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کے بعد رجوع کرلینے کی اجازت مرحمت فرمائی جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان تینوں کو ایک ہی قرار دیا گیا۔

اس استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

وَاَمَّا الرِّوَايَةُ الَّتِي رَوَاهَا الْمُخَالِفُوْنَ اَنَّ رُكَانَةَ طَلَّقَ ثَلَاثًا فَجَعَلَهَا وَاحِدَةً فَرِوَايَةٌ ضَعِيفَةٌ عَن قَوْمٍ مَجْهُولِينَ وَاِنَّمَا الصَّحِيحُ مَا قَدَّمْنَاهُ اَنَّهُ طَلَّقَهَا اَلْبَتَّةَ وَلَفْظُ الْبَتَّةِ مُحْتَمِلٌ لِلْوَحْدَةِ

رہی وہ روایت جس کو مخالفین نے بیان کیا کہ رکانہ رضؓ نے تین طلاقیں دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک قرار دیا تو ضعیف روایت ہے جو مجہول لوگوں سے مروی ہے صحیح تو وہی حدیث ہے جس کو ہم

وللثلاث ولعل صاحب هذه الروایة الضعیفة اعتقد ان لفظ البتة یقتضی الثلاث فرواه بالمعنی الذی فهمه وغلط فی ذالک

(نووری شرح مسلم ص ۴۷۸ ج ۲)

نے بیان کیا کہ انہوں نے اپنی عورت کو طلاق البتہ دی تھی اور لفظ البتہ ایک اور تین ہر ایک کا احتمال رکھتا ہے اور شاید اس ضعیف روایت کے راوی نے اس بات کا خیال کیا کہ لفظ البتہ تین طلاقوں کا تقاضہ کرتا ہے اور اپنی سمجھ کے اعتبار سے روایت بیان کرکے اس میں غلطی کی۔

یعنی جس روایت میں حضرت رکانہ رضؓ کے تین طلاق دینے کی صراحت ہے وہ روایت ضعیف ہے بلکہ صحیح روایت یہ ہے کہ انہوں نے طلاق "البتة" دی تھی اور لفظ "البتة" ایک طلاق اور تین طلاق دونوں کو محتمل ہے۔ شاید راوی نے "البتة" کو تین سمجھا اور اپنی سمجھ کے اعتبار سے تین طلاق کی صراحت کردی اور اس سلسلہ میں اس سے غلطی واقع ہوگئی علامہ نووی رحؒ نے جس صحیح حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ سنن ابوداؤد میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

عن نافع بن عجیز بن عبد یزید بن رکانة ان رکانة طلق امرأته سهمة البتة فاخبر النبی صلی الله علیه وسلم بذالک وقال والله ما اردت الا واحدة فقال رسول الله صلی الله ما اردت الا واحدة فقال رکانة والله ما اردت الا واحدة

نافع بن عجیز ابن عبد یزید ابن رکانہ بیان کرتے ہیں کہ رکانہ رضؓ نے اپنی بیوی سہمہ کو طلاق البتہ دیدی اور اسکی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور کہا خدا کی قسم میں نے صرف ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا تو حضور نے فرمایا خدا کی قسم تم نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا؟ تو رکانہ نے کہا خدا کی قسم میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا تو حضور صلی اللہ

فَرَدَّهَا الیه رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ابوداؤد ص ۳۰۰ ج ۱)
علیہ وسلم نے عورت کو رکانہ کی طرف لوٹا دیا۔

یہی روایت سنن ابو داؤد میں عبداللہ ابن علی کی روایت سے بھی مروی ہے تین طلاق والی روایت کے راوی ابن جریج ہیں اور "البتۃ" والی روایت کے راوی (۱) نافع ابن عجیز ابن عبد یزید بن رکانہ رضؓ (۲) عبداللہ بن علی ابن یزید ابن رکانہ رضؓ ہیں۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ ان روایتوں کی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال ابوداؤد حدیث نافع بن عجیز و عبد اللہ بن علی ابن یزید بن رکانۃ عن ابیہ عن جدہٖ ان رکانۃ طلق امرأتہ فردھا الیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصح لان ولد الرجل واھلہ اعلم بہ ان رکانۃ انما طلق امرأتہٗ البتۃ فجعلھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واحدۃ۔

(ابوداؤد ص ۲۹۹ ج ۱)

امام ابو داؤد کہتے ہیں نافع ابن عجیز اور عبداللہ ابن علی ابن یزید ابن رکانہ اپنے باپ (علی) اور وہ عبداللہ کے دادا (یزید) سے روایت کرتے ہیں کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوی کو ان کی طرف لوٹا دیا یہ حدیث اصح ہے کیونکہ آدمی کا لڑکا اور اس کے گھر والے اس کے سلسلہ میں زیادہ معلومات رکھتے ہیں کہ رکانہ رضؓ نے تو اپنی بیوی کو طلاق البتۃ ہی دی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک ہی قرار دیا تھا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

ھذا اصح من حدیث ابن جریج
(ابوداؤد ص ۳۰۱ ج ۱)

یہ (یعنی طلاق البتۃ والی حدیث) ابن جریج کی حدیث سے اصح ہے۔

علامہ ابن حجرؒ مسند احمد اور ابو داؤد کی ان روایتوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

وفی سندھما ابن اسحق وفیہ مقال۔ (بلوغ المرام ص ۱۳۵)

ان دونوں کی سند میں ابن اسحق ہیں اور ان کے سلسلہ میں کلام ہے۔

ابن اسحاق کے بارے میں کتب اسماء الرجال سے تحقیق کرتے ہوئے مولانا سرفراز صفدر صاحب لکھتے ہیں امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ضعفائے صغیر للنسائی ص ۵۲) امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (کتاب العلل ص ۴۳۲ ۱۴) امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں وہ قابل احتجاج نہیں محدث سلیمان تیمیؒ فرماتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام ہشام ابن عروہ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام یحییٰ ابن سعید القطانؒ فرماتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے (میزان ص ۲۱ ج ۳)

(عمدۃ الاثاث ص ۱۰۹)

الحاصل سنن ابو داؤد اور مسند احمد بن حنبل کی یہ روایت جو ابن جریج اور ابن اسحاق کے طرق سے مروی ہے جس میں تین طلاق دینے کی صراحت ہے۔

ضعیف مجروح اور ناقابلِ استدلال ہے اس کے برخلاف ابو داؤد کی وہ روایت جو نافع ابن عجیز اور عبداللہ بن علی کے طریق سے مروی ہے جس میں "البتۃ" کی صراحت ہے وہ قوی راجح اور قابل استدلال ہے۔

یہ مختصر مباحث مسئلہ زیر بحث کو سمجھنے کے لئے انشاء اللہ کافی ہوں گے اس لئے انہیں پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔

الماخذوالمراجع

فہرست کتب	اسمائے مصنفین
القرآن الکریم	
صحیح بخاری شریف	امام محمد بن اسماعیل البخاری رح
صحیح مسلم شریف	امام ابوالحسین مسلم رح بن الحجاج
نسائی شریف	امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب النسائی
ابوداؤد شریف	امام سلیمان بن الاشعث ابوداؤد السجستانی رح
ترمذی شریف	امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی
موطا امام مالک	امام مالک رح
شرح معانی الآثار	ابوجعفر احمد رح بن محمد الطحاوی رح
تفسیر ابن کثیر	حافظ ابوالفدا اسماعیل رح بن عمر رح ابن کثیر رح
تفسیر طبری	امام جریر طبری رح
تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح
مدارک التنزیل	امام عبداللہ ابن احمد نسفی رح
المحلی	علامہ ابو محمد بن حزم الظاہری رح
مشکوٰۃ شریف	شیخ ولی الدین الخطیب التبریزی رح
فتح الباری	علامہ شہاب الدین المعروف بابن الحجر العسقلانی رح
نووی شرح مسلم	شیخ محی الدین ابوزکریا یحییٰ النووی رح

اسمائے مصنفین	فہرست کتب
مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رح	تحفۃ الاحوذی
امام احمد ابن حنبل	مسند امام احمد ابن حنبل
حافظ عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی رح	مصنف عبدالرزاق
امام ابوبکر بن ابی شیبہ رح	مصنف ابن ابی شیبہ
امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی رح	بیہقی سنن کبریٰ
ملا علی القاری رح	مرقات شرح مشکوٰۃ
ابو عبداللہ شمس الدین محمد المعروف بابن القیم رح	تہذیب سنن ابی داؤد بحوالہ عمدۃ الاثار
امام دار قطنی رح	دار قطنی
علامہ ظہیر الدین شوق نیموی رح	التعلیق الحسن
علامہ ظہیر الحسن شوق نیموی رح	آثار السنن
علامہ ظفر احمد تھانوی رح	علاء السنن
الحافظ ابن الحجر عسقلانی رح	بلوغ المرام
مولانا سرفراز صفدر صاحب رح	عمدۃ الاثاث
حافظ شمس الدین الذہبی رح	میزان الاعتدال
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح	حجۃ اللہ البالغہ
امام علاء الدین ابوبکر الکاسانی رح	بدائع الصنائع
علامہ ابن الرشد الاندلسی رح	بدایۃ المجتہد
ابو العباس تقی الدین احمد المعروف بابن تیمیہ رح	منہاج السنہ
حافظ شمس الدین الذہبی رح	المنتقی
شیخ کمال الدین ابن الہمام رح	فتح القدیر

فہرست کتب	اسمائے مصنفین
المقنع	امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ رح
عمدۃ القاری	حافظ بدر الدین العینی رح
حاشیہ سندھی	علامہ ابوالحسن سندھی رح
شرح نخبۃ الفکر	حافظ ابن الحجر عسقلانی رح
فتاویٰ عزیزی	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح
لطائف قاسمی	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح
کفایہ بحوالہ رکعات التراویح	امام خطیب البغدادی رح
الانتقاد الرجیح بحوالہ رکعات التراویح	نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی رح
قیام اللیل بحوالہ التراویح	امام محمد بن نصر المروزی رح
مکتوب حضرت مولانا نانوتوی صاحب (مندرجہ لطائف قاسمی)	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح
مکتوب حضرت مولانا گنگوہی صاحب	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح
رسالۂ تراویح مندرجہ تالیفات رشیدیہ	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمان محدث اعظمی رح
ضمیمہ رکعات التراویح	مولانا عبداللہ غازی پوری رح
الدین الخالص	نواب صدیق حسن صاحب بھوپالی رح
رسالہ المآثر	ایڈیٹر مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

چھٹا محاضرہ علمیہ

بر موضوع

ردِّ غیر مقلدیت

پیش کردہ

جناب مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی

استاذ فقہ وتفسیر دار العلوم دیوبند

فہرست مضامین

- مسائل نماز ۳
- تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھانا چاہیے ۳
- ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ۴
- ان لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا مطلب ۶
- چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کے قائل نہیں ۶
- جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ سے پڑھنا ۷
- امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے ۷
- نماز میں آمین آہستہ سے کہنا ۱۳
- نماز کے اندر صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین ۱۷
- رکوع میں رفع یدین ۱۸
- دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین ۱۸
- سجدوں کے لیے رفع یدین ۱۹
- نمازِ وتر واجب ہے ۲۴
- وتر کی تین رکعتیں ایک ہی سلام سے ثابت ہیں ۲۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم.

اس محاضرہ میں نماز سے متعلق ان مسائل کو احادیث صحیحہ کی روشنی میں ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے جن میں غیر مقلدین اہل حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یاد رکھنے کی سہولت کے پیش نظر تفصیل سے گریز کیا گیا ہے۔

مسائلِ نماز

"تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کانوں تک اٹھانا چاہیے"

عن مالك ابن الحويرث رضی اللہ عنہ قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كبر رفع يديه حتى يحاذى بهما اُذُنيه، وفى رواية حتى يحاذى بهما فروع اذنيه. (متفق عليه مشكوٰة: ج:۱،ص:۷۵. باب صفة الصلوٰة مسلم: ج:۱،ص:۱۶۸)

ترجمہ: حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو اٹھاتے تھے یہاں تک کہ انہیں کانوں کے برابر کر دیتے اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں یہاں تک کہ ہاتھوں کو کانوں کے اوپری حصہ کے مقابل کر دیتے۔

وذكر الطيبى، ان الشافعیؒ حين دخل مصر سئل عن كيفية رفع اليدين عند التكبير، فقال: يرفع المصلى يديه بحيث يكون كفاه حذاء منكبيه وابهاماه حذاء شحمتى اذنيه واطراف اصابعه حذاء فروع اذنيه. لانه جاء فى رواية. يرفع اليدين الى المنكبين وفى رواية. الاذنين وفى رواية. الى فروع الاذنين. فعمل الشافعى بما ذكرناه فى رفع اليدين، جمعًا بين الروايات الثلاث. (مرقاة المفاتيح: ج:۲،ص:۲۵۴)

ترجمہ: طیبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو ان سے تکبیر میں رفع یدین کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا گیا؟ تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ نماز پڑھنے والا اپنے دونوں ہاتھوں کو

اس طور پر اٹھائے کہ اس کی دونوں ہتھیلی اس کے دونوں کندھوں کے اور اس کے دونوں انگوٹھے اس کے دونوں کانوں کی لووٗں کے برابر اور اس کی انگلیوں کے کنارے اس کے کانوں کے اوپری حصوں کے برابر ہو جائیں اس لیے کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ دونوں ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے دوسری روایت میں ہے کہ دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور تیسری روایت میں ہے کہ دونوں ہاتھ کانوں کے اوپری حصوں تک اٹھائے۔تو دیکھئے! حضرت امام شافعیؒ نے رفع یدین کے سلسلہ میں تینوں روایتوں کو جمع کرتے ہوئے اس شکل پر عمل کیا جس کو ہم نے ذکر کیا۔

الحمدللہ احناف کا اسی پر عمل ہے۔لیکن اس کے برخلاف غیر مقلدین کہتے ہیں کہ ہاتھ صرف کندھوں تک اٹھانا چاہیے۔

چنانچہ خالد گرجاکھی صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے''۔(صلاۃ النبی:ص:۱۵۲)

امام خاں نوشہروی لکھتے ہیں:

''تکبیر کے وقت دونوں ہاتھ کندھوں تک یا ذرا اور اوپر اٹھانا چاہیے''۔(اہل حدیث کے دس مسئلے:ص:۲۸)

ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا

عن علقمه بن وائل بن حجر عن ابيه قال: رايت النبى صلى الله عليه وسلم يضع يمينهٗ على شمالهِ تحت السرة. (مصنف ابن ابی شیبہ:طبع: کراچی: ج:۱،ص:۳۹)

قال الحافظ قاسم بن قُطْلُوْبغا في تخريج احاديث الاختيار شرح المختار. هذا سندٌ جيدٌ. وقال العلامة محمد ابوالطيب المدنى فى شرح الترمذي. هذا حديث قوى من حيث السند. وقال المحقق عابد السندهي فى طوالع الانوار. رجاله ثقاة.

ترجمہ: علقمہ بن وائل اپنے والد یعنی وائل ابن حجر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ نماز میں آپ اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔

نیز اس سلسلہ میں حضرت علیؓ، حضرت انسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مختلف روایتیں آئی ہیں۔

سینے پر ہاتھ باندھنے کی بھی روایتیں ہیں۔ لیکن اس درجہ قوی نہیں ہیں، لیکن ان تمام روایتوں کو بالائے طاق رکھ کر غیر مقلدین ہاتھوں کو سینے کے اوپر باندھنے پر مُصر ہیں اور ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو نامناسب اور بے دلیل سمجھتے ہیں۔

مولوی خالد گرجاکھی لکھتے ہیں:

”مذکورہ طریقہ کے مطابق سینہ پر ہاتھ باندھنا ہی صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ زیر ناف باندھنا ویسے ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے نیز زیر ناف ہاتھ باندھنے کی دلیل بھی کوئی نہیں ہے“۔ (صلاۃ النبی: ص:۱۵۷)

دیکھا! صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ناف کے نیچے ہاتھ باندھے ہوئے دیکھا۔ اور جناب اہل حدیث صاحب فرماتے ہیں کہ ”زیرناف ہاتھ باندھنا ویسے ہی نامناسب معلوم ہوتا ہے“۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو نامناسب کہنے والا اہل ایمان بھی رہ جاتا ہے کہ نہیں؟ اہل حدیث ہونا تو دور کی بات ہے۔ لیکن یہ گروہ مقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی مبارک احادیث کے ساتھ چاہے جو بھی سلوک کرے، لیکن رہے گا اہل حدیث ہی۔

حکیم فیضِ عالم نے تو اس سنت کو نامناسب کہنے سے بھی آگے بڑھ کر اس کا استہزاء کیا ہے۔ جناب کی گل افشانی دیکھئے! فرماتے ہیں:

”یہاں ایک لطیفہ یاد آیا ہے کہ خلفائے بنی عباس میں سے ہارون کا ایک نماز میں ازار کھل گیا۔ اور اس نے سینے سے ہاتھ نیچے کر کے ازار بند سنبھال لیا۔ نماز سے فراغت کے بعد مقتدیوں نے حیرانی سے ہارون رشید کے اس فعل کو دیکھا۔ قاضی ابو یوسف صاحب نے فتویٰ دیا کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ہی صحیح ہے“۔ (اختلاف امت کا المیہ: ص:۷۸)

دیکھئے! جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول ہے جسے حضرت علیؓ ”سنت“ حضرت انسؓ ”اخلاق نبوت“ میں شمار کرتے ہیں۔ یہ غیر مقلد ایک جعلی واقعہ گڑھ کر اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ رہی امام ابو یوسفؒ کے خلاف بدگمانی اور بدزبانی تو اکابرِ امت کے ساتھ تو ان حضرات کا رات و دن کا یہی

مشغلہ ہے۔ اس کے بغیر تو ان کے یہاں اہل حدیث ہونے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

ان لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا مطلب

ان حضرات کے اہل حدیث ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ لوگ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہیں۔ بلکہ اہل حدیث ہونے کا مطلب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ ہم جو عمل کرلیں وہ حدیث ہو جاتا ہے۔ اور ہمارے عمل ہی کا نام بخاری اور مسلم ہے۔

چنانچہ سینے پر ہاتھ باندھنے کی ایک روایت بھی بخاری اور مسلم میں نہیں آئی ہے۔ لیکن مولانا ثناءاللہ امرتسری صاحب بڑی جسارت کے ساتھ لکھتے ہیں:

"سینہ پر ہاتھ باندھنے اور رفع یدین کرنے کی روایات بخاری و مسلم اور ان کی شروحات میں بکثرت ہیں"۔ (فتاویٰ ثنائیہ: ج:۱، ص:۴۴۳)

میں تمام غیر مقلدوں سے گذارش کرتا ہوں کہ اس سلسلہ کی ایک روایت بھی بخاری اور مسلم سے نکال کر دکھلائیں اور اگر ایسا نہیں کرتے اور انشاءاللہ ہرگز نہیں کرسکتے تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ آپ جو عمل کرلیتے ہیں اسی کا نام آپ لوگوں کے یہاں بخاری اور مسلم ہے اور یہی مطلب ہے آپ لوگوں کے اہل حدیث ہونے کا۔

چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ چاروں اماموں میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمہ، ص:۳۲)

بلکہ ایک روایت میں تو اس سے ممانعت آئی ہے۔

علامہ ابن قیم شاگرد علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

ویکرہ ان یجعلھا علی الصدر ذالک لماروی عن النبی ﷺ انہ نھی عن التکفیر وھو وضع الید علی الصدر. (بدائع الفوائد: ج:۳، ص:۹۱)

اور سینہ پر ہاتھ رکھنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے تکفیر سے منع کیا ہے۔ اور تکفیر سینے پر ہاتھ رکھنے کو کہتے ہیں۔

جہری نماز میں بسم اللہ آہستہ پڑھنا

عن انسؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وابا بکر وعمر کانوا یفتتحون الصلوٰۃ بالحمدللہ رب العلمین. (اخرجہ مسلم: ج:۱، ص:۱۷۲، مشکوٰۃ شریف: ج:۱، ص:۷۹، باب صفۃ الصلوٰۃ بخاری: ج:۱، ص:۱۰۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما الحمد للہ رب العالمین کے ذریعہ نماز شروع کیا کرتے تھے۔

قال العینی واحادیث الجهر وان کثرت رواتها فکلها ضعیفة ولیست مخرجة فی الصحاح ولا فی الاسانید المشهورة. (حاشیۃ البخاری: ص:۱۰۳، ج:۱)

ترجمہ: علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ جہر کی روایتیں اگرچہ ان کے راوی بہت ہیں مگر وہ سب ضعیف ہیں اور صحاح نیز اسانید مشہورہ میں مذکور نہیں ہیں۔

اس کے برخلاف غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ جہری نماز میں بسم اللہ پکار کر پڑھنا چاہیے جناب یونس دہلوی صاحب فرماتے ہیں:

''جہری نماز میں پکار کر اور سری نماز میں آہستہ پڑھنا بہتر ہے''۔ (دستور المتقی: ص:۹۲)

یعنی جس عمل کو حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نہیں فرماتے تھے۔ وہی ان کے نزدیک بہتر ہے۔

امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ''

(الاعراف: پارہ۹۔ آیت:۲۰۴)

ترجمہ: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو۔ اور چپ رہو۔ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اہل علم کا اجماع ہے کہ اس آیت سے مراد امام کا نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ علامہ حافظ ابوعمر یوسف بن عمر المعروف بابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ فرماتے ہیں:

مع اجماع اهل العلم ان مراد اللہ من ذلك فی الصلوٰة المکتوبة

(التمہید، ص:۳۰، ج:۱۱)

ترجمہ: اہل علم کا اجماع ہے کہ اللہ کی مراد اس سے فرض نمازوں میں چپ رہنا ہے۔

امام موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ متوفی: ۶۲۰ھ فرماتے ہیں:

عن سعید بن المسیب والحسن وابراهیم ومحمد بن کعب والزهری انها نزلت فی شان الصلاة وقال زید بن اسلم وابوالعالیه کانوا یقرؤن خلف الامام فنزلت "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" الایة وقال احمد فی روایة ابی داؤد اجمع الناس علی ان هذه الآیة فی الصلاة (المغنی: ج: ۲، ص: ۲۲۹)

ترجمہ: سعید بن مسیب حسن بصری، ابراہیم محمد بن کعبؒ اور زہری کہتے ہیں آیت مذکورہ نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور زید بن اسلم اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قراءۃ کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی امام ابوداؤد کی روایت کے مطابق امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔

جب ثابت ہوا کہ آیت کریمہ نماز کے بارے میں ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جب نماز میں امام قرآن کریم پڑھے تو مقتدی حضرات چپ چاپ سنیں۔ آیت کے عموم سے پتہ چلتا ہے کہ چاہے امام سراً پڑھے، چاہے جہراً پڑھے چاہے مقتدی سن پاتا ہے یا نہیں سن پاتا۔ اسے چپ رہنا چاہیے "فاستمعوا" کے بعد "انصتوا" کا لفظ اس بات کو بتلانے کے لیے ہے کہ سن سکو تو سنو! ورنہ چپ چاپ رہو!۔

امام ابوبکر احمد بن علی رازی الجصاص متوفی ۳۷۰ھ فرماتے ہیں:

وکما دلت الآیة علی النهی عن القراءة خلف الامام فیما جهر به، فهی دلالة علی النهی فیما یخفی. لانه اوجب الاستماع والانصات. عند القرأة ولم یشترط فیه حال الجهرمن الاخفاء. فاذا جهر فعلینا الاستماع والانصات. واذخفی فعلینا الانصات. بحکم اللفظ لعلمنابه قاری القرآن.

ترجمہ: پھر یہ آیت جہری نمازوں کی طرح سری نمازوں میں بھی قراءت کرنے سے مانع ہے کیوں کہ آیت میں جہر و سر کی قید کے بغیر محض قراءت قرآن کے وقت استماع وانصات کو واجب کیا گیا ہے۔ لہٰذا امام کی جہری قراءت کے وقت استماع اور انصات ہم پر ضروری ہوگا۔ اور جب وہ سری قراءت

کرے تو ہم پر انصات ضروری ہے۔ لفظ انصات کو دیکھتے ہوئے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرآن پڑھ رہا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کا یہ قول مفصل اور محققانہ ہے:

"فان للعلماء فیه ثلاثة اقوال: قيل ليس له ان يقرأ حال جهر الامام اذا كان يسمع لا بالفاتحة ولاغيرها، وهذا قول الجمهور من السلف والخلف وهذا مذهب مالك، واحمد، وأبى حنيفة وغيرهم واحدقولى الشافعي- وقيل يجوز الامران. والقراء ة افضل. ويروى هذا عن اوزاعى واهل الشام وليث بن سعد وهو اختيار طائفة من اصحاب احمد وغيرهم-وقيل بل القرأة واجبة. وهو القول الاخير للشافعي، وقول الجمهور هو الصحيح. فانه سبحانه تعالىٰ. قال:"وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" قال احمد اجمع الناس على انها نزلت فى الصلوٰة.

(فتاوى شيخ الاسلام: ج: ۲۲، ص: ۲۹٤)

ترجمہ: علماء کے اس سلسلہ میں تین قول ہیں ایک یہ کہ مقتدی کے لیے امام کی جہر کی حالت میں جب کہ مقتدی سن رہا ہو قراءت جائز نہیں ہے۔ نہ تو فاتحہ نہ اس کے علاوہ کی۔ یہی قول سلف وخلف کا ہے۔ یہی امام مالک اور امام احمد امام ابوحنیفہ وغیرہ کا مذہب ہے۔ اور ایک قول امام شافعیؒ کا بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ دونوں جائز ہے۔ لیکن پڑھنا افضل ہے۔ یہی اوزاعی - اہل شام - لیث بن سعد اور امام احمد کے اصحاب کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ قراءت واجب ہے۔ اور یہی امام شافعیؒ کا آخری قول ہے۔ لیکن جمہور کا قول صحیح ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ اِلخ" امام احمد فرماتے ہیں کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام کے پیچھے قراءت کو قرآن کریم کے اس صاف صاف منع کردینے کے بعد اب اس مسئلہ میں کسی بھی دلیل اور کلام کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن احادیث چوں کہ قرآن کریم کی شارح ہیں۔ اس لیے اس خاص ممانعت کے سلسلہ میں وارد سیکڑوں احادیث کے ذخیرہ سے ہم صرف دو حدیثیں

پیش کرتے ہیں۔

(۱) عن ابی موسیٰ الاشعری قال: ان رسول اللہ ﷺ خطبنا فبین لنا سنتنا، وعلمنا صلواتنا فقال: اذاصلیتم فاقیموا صفوفکم، ثم لیؤمّکم احدکم فاذاکبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا و اذا قال. غیر المغضوب علیھم ولاالضالین فقولوا: آمین. یجبکم اللہُ.

(مسلم: ج:۱، ص: ۱۷۴)

ترجمہ: حضرت ابوموسی اشعریؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور ہمارے لیے طریقہ زندگی کو بیان فرمایا، اور ہمیں ہماری نماز سکھائی، اور فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے تیاری کرو تو اپنی صفوں کو درست کرو اور تم میں سے ایک آدمی تمہاری امامت کرے! پھر جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو! اور جب وہ قراءت کرے تو تم چپ رہو! اور جب وہ **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین** کہے تو تم آمین کہو! اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو سنیں گے۔

اس صحیح حدیث میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ ہیں: "**واذا قرأ فانصتوا**" یعنی جب امام پڑھے خواہ سراً خواہ جہراً تو تم چپ چاپ رہو۔ چاہے سنو چاہے نہ سنو۔

(۲) عن جابر قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام قرأۃ لہ" (مسند احمد بن منیع بحوالہ فتح القدیر: ج:۱، ص: ۲۹۵، وقال البوصیری فی اتحاف الخیرۃ المھرۃ بزوائد المسانید العشرۃ: ج:۲، ص: ۲۴۳. صحیح علی شرط الشیخین)

ترجمہ: جس شخص کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہوگی۔

اس حدیث میں مَن کا لفظ عام ہے۔ جس نے کسی امام کی اقتداء کرلی، خواہ نماز جہری یا سری ہو تو بلا کسی تخصیص کے امام کے پیچھے الگ سے نہ پڑھے۔ کیوں کہ امام کی قراءت شرعاً اس کی قراءت مان لی گئی ہے۔ اب **لاصلاۃ الابفاتحۃ الکتاب** والی حدیث پر عمل ہوگیا ہے۔ اس لیے امام کے پیچھے پڑھنا۔ یا امام کے سکتوں میں پڑھنا، یا امام کے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد رکنے کی حالت میں پڑھنا۔ قرآن وحدیث کی اس صریح ممانعت کے خلاف ہے۔ قرآن وحدیث سے دور دور تک اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ امام ابن تیمیہؒ نے اس کو بدعت لکھا ہے: فرماتے ہیں:

وایضا فلوکان الصحابة کلهم یقرؤن الفاتحة خلفه، اما فی السکتة الاولی، واما فی السکتة الثانیة، لکان هذا مما تتوفرلهم الدواعی علی نقله فکیف ولم ینقل هذ احدٌ من الصحابة، انهم کانوا فی السکتة الثانیة خلفه یقرؤون الفاتحة مع ان ذلك لوکان مشروعاً لکان الصحابة احق الناس بعلمه وعمله. فعلم انه بدعة. (مجموعه فتاویٰ شیخ الاسلام: ج:۲۳، ص:۲۷۸-۲۷۹)

ترجمہ: نیز اگر سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سورہ فاتحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پڑھتے، چاہے پہلے سکتہ میں، یا دوسرے سکتہ میں، تو یہ وہ چیز تھی جسے بکثرت منقول ہونا چاہیے تھا، جب کہ ایک صحابیؓ سے بھی اس طرح کی کوئی چیز منقول نہیں ہے۔ حالاں کہ اگر یہ چیز مشروع ہوتی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اسے جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا سب سے زیادہ حق تھا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ عمل بدعت ہے۔

خود علامہ یمن محمد بن اسماعیل امیر یمانی متوفی ۱۱۸۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

ثم اختلف القائلون بوجوب القرأة فقیل فی محل سکتات الامام وقیل فی سکوته بعد تمام القراءة- ولا دلیل لهذین القولین فی الحدیث.

ترجمہ: پھر قراءت کو واجب کہنے والوں نے اختلاف کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ امام کے سکتوں کے موقع پر پڑھے۔ بعض کہتے ہیں امام کے قراءت مکمل کر لینے کے بعد سکوت کرتے وقت پڑھے لیکن ان دونوں قولوں کی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

انہوں نے صاف فرمادیا کہ کسی بھی سکتے میں پڑھنے کی بات کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ اس سلسلہ میں بڑی فیصلہ کن بات فرماتے ہیں:

فاالنزاع من الطرفین، لکن الذین ینهون عن القراءة خلف الامام جمهور السلف والخلف ومعهم الکتاب والسنة الصحیحة والذین اوجبوا ها علی الماموم. فحدیثهم ضعیفة. عند الائمة.

(تنوع العبادات: ص:۸۶. بحواله احسن الکلام: ص:۱٦۵)

ترجمہ: مسئلہ زیر بحث میں دونوں طرف سے نزاع ہے۔ لیکن قراءت خلف الامام سے منع کرنے والے جمہور خلف وسلف ہیں، اور ان کے ساتھ کتاب الٰہی اور احادیث صحیحہ ہیں، اور جو لوگ مقتدی پر قراءت واجب کرتے ہیں ان کی مستدل حدیث ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے۔

لیکن ان اہل حدیث کہلانے والوں کا جواب نہیں فرماتے ہیں:

''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا'' (الاعراف: پارہ:۹، ۲۰۴)؟

جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو یا حدیث و اذا قرأ فانصتوا (بشرط صحت)

جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو، کا مطلب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی سورۃ فاتحہ کے علاوہ باقی قراءت خاموشی سے سنیں امام کے ساتھ قرآن نہ پڑھیں، یا امام سورۃ فاتحہ کی آیات وقفوں کے ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی بھی احادیث صحیحہ کے مطابق سورۂ فاتحہ پڑھ سکیں یا امام سورۂ فاتحہ کے بعد اتنا سکتہ کرے کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں۔ (تفسیری حواشی جناب صلاح الدین یوسف: ص:۲۔ شائع کردہ سعودی حکومت)

کیا سورۃ الفاتحہ قرآن میں داخل نہیں ہے؟ جو آپ اسے اذا قرئ القرآن سے خارج کررہے ہیں؟ آپ امام کو سورۃ الفاتحہ وقفوں کے ساتھ پڑھنے کی تلقین کس حدیث سے کررہے ہیں۔ نماز میں آپ کا حکم چلے گا یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا؟ نیز امام کو سورۃ الفاتحہ پڑھنے کے بعد اتنا طویل سکتہ کرنے کا حکم آپ کس حدیث سے دے رہے ہیں؟ کیا نماز آپ کی ذاتی ملکیت ہے کہ آپ جو چاہیں اس پر تصرف کریں؟ ''واذا قرئ فانصتوا'' مسلم شریف کی روایت ہے لیکن چوں کہ آپ کے عمل کے خلاف ہے اس لیے بین القوسین بشرط صحت لکھ کر آپ نے اس کی صحت میں شبہ کا اظہار کردیا۔ ان سب کے باوجود بھی آپ اہل حدیث ہی رہے۔ تعجب ہے۔ سعودی حکومت پر کہ اس نے ایسی تفسیر شائع کی ہے، جس کی صرف پانچ سطروں کے اندر قرآن وحدیث کی اس قدر خلاف ورزیاں ہیں۔ اس طرح کی تفسیروں کی اشاعت سے امتِ مسلمہ اور قرآن کریم کی کیا خدمت انجام پا سکتی ہے؟۔

اسی طرح ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:

''جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم بے کار اور باطل ہے۔ (فصل الخطاب فی قراءۃ فاتحہ الکتاب، ص:۱۔ طبع ثانی مطبوعہ کتب خانہ اہل حدیث لاہور)

یہ شخص جناب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرامؓ سمیت تقریباً پوری امت مسلمہ کی نمازیں کھا جانے کے درپے ہے۔ کیا قرآن وحدیث کے خلاف اسی ذہنیت کا نام اہل حدیث ہونا ہے۔
اسی طبقہ کے ایک اور صاحب گل کھلاتے ہیں ''مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے لہٰذا اس کی نماز نہیں، جس کی نماز نہیں، وہ بے نماز ہے۔ بے نماز کافر ہے اور وہ مخلد فی النار ہے؟۔ (اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع، ص:۱ طبع کردہ فیجر رسالہ اہل حدیث، صدر دہلی، بحوالہ احسن الکلام: ص:۵۵)
اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ یہ شخص کس کس کو جہنم میں لے جانا چاہتا ہے۔

''نماز میں آمین آہستہ سے کہنا''

قال عطاء آمین دعاء (بخاری: ج:۱، ص:۱۰۷)

ترجمہ: حضرت عطاؒ فرماتے ہیں کہ آمین دعا ہے۔

وقال اللّٰہ تبارك وتعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْیَةً. (۵۵:۸)

ترجمہ: اور باری تعالی کا ارشاد ہے کہ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے۔
جب آمین دعا ہے۔ اور دعا آہستہ ہی ہونی چاہیے اور یہی بہتر ہے۔ لیکن کبھی کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ دلانے اور سکھانے کے لیے زور سے بھی پڑھ دی ہے۔
حافظ ابن القیم زاد المعاد میں فرماتے ہیں:

فاذا جهر به الامام احیاناً لیعلم المامومین فلاباس بذلك فقد جهر عمرؓ بالافتتاح لیعلم المامومین وجهرا بن عباس بقرائة الفاتحة فی صلوة الجنازة لیعلم انها سنة ومن هذا ایضا جهر الامام بالتأمین وهذا الاختلاف المباح الذی لایعنف فیه من فعله ولا من ترکه. (بحواله آثار السنن: ج: ۱، ص: ۹۲)

ترجمہ: اگر کبھی امام قنوت نازلہ مقتدیوں کو سکھانے کے لیے جہر کے ساتھ پڑھ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے مقتدیوں کو سکھانے کے لیے ''ثناء جہر'' کے ساتھ پڑھی تھی۔ اسی طرح ابن عباسؓ نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ زور سے پڑھی تھی تاکہ مقتدیوں کو بتائیں کہ وہ سنت ہے۔ اسی قبیل سے امام کا آمین بھی زور سے پڑھنا ہے یہ وہ مباح اختلاف ہے جس میں جہر کرنے یا نہ کرنے والے پر کوئی سختی نہیں کی جاسکتی۔

عن أبی هریرةؓ أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال اذا قال الامام غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقولوا آمین. فانه من وافق قوله. قول الملائکة غفرله ما تقدم من ذنبه.

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام غیر المضوب علیهم ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو۔ اس لیے کہ جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہوجائے گا تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجائیں گے۔

عن ابی هریرةؓ واذا قال ولاالضالین فقولوا آمین. (مسلم: ج:۱، ص:۱۷۷)

ترجمہ: جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

عن ابی موسیٰ الاشعری فی حدیث طویل......واذا قال غیر المغضوب علیهم ولاالضالین فقولوا آمین یُجبْکم اللّٰه (مسلم: ج:۱، ص:۱۷۴)

ترجمہ: جب امام غیر المغضوب علیهم ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائیں گے۔

ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود امام آہستہ آمین کہے گا اس لیے کہ اگر امام جہر کے ساتھ آمین کہتا تو سیاق کلام کا تقاضا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرماتے:

اذا قال آمین فقولوا آمین.

ترجمہ: جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو۔

صاحب آثار السنن فرماتے ہیں:

قال النیموی یستفاد منه ان الامام لایجهربآمین وقال فی التعلیق الحسن قوله یستفادمنه الخ قلت لان تامین الامام لوکان مشروعاً بالجهر لما علق النبی صلی اللّٰه علیه وسلم تامینهم بقوله ولا الضالین بل السیاق یقتضی انه لم یقل الا هٰکذا واذا قال آمین فقولوا آمین. (آثار السنن مع التعلیق الحسن، ص:۹۵، ج:۱)

ترجمہ: نیمویؒ کہتے ہیں کہ حدیث سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ امام آمین بالجہر نہیں کہے گا۔ تعلیق حسن میں حدیث سے اس ماخوذ بات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ اگر امام کا آمین بالجہر کہنا

شروع ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مقتدیوں کے آمین کہنے کو امام کے ولا الضالین کہنے پر معلق نہ کرتے، بلکہ سیاقِ کلام کا تقاضا تھا کہ یوں فرماتے کہ جب امام آمین کہے، تو تم آمین کہو۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے، حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد سے کہ جب قاری وامام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، ثابت ہوتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ امام ہی پڑھے گا مقتدی نہیں پڑھے گا۔ کیوں کہ اگر مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھتا تو پھر یہ نہ فرماتے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ بلکہ آپ ﷺ یوں فرماتے کہ جب تم ولا الضالین کہہ چکو تو آمین کہو۔ دیکھئے یہ بخاری ومسلم کی تین روایتیں ہیں جن سے امام کا آہستہ سے آمین کہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بخاری ومسلم کی کسی ایک روایت سے بھی امام اور مقتدی کسی کے بھی زور سے آمین کہنے کا ثبوت نہیں ہوتا ہے۔ صاحب آثار السنن فرماتے ہیں:

قال النیمویؒ لم یثبت الجهر بالتأمین عن النبی ﷺ ولا عن الخلفاء الاربعةؓ وما جاء فی الباب فهو لا یخلو من شیئ۔ (آثار السنن: ج:۱، ص:۹۴)

ترجمہ: آمین بالجہر نہ تو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی خلفائے راشدین سے اور اس باب میں جو بھی حدیث ہے وہ علت سے خالی نہیں ہے۔

جہر کے سلسلہ میں ابوداؤد اور ترمذی کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔

عن وائل بن حجرؓ قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا قرأ ولا الضالین قال آمین رفع بها صوته.

ترجمہ: وائل بن حجرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ولا الضالین پڑھتے تھے تو آمین کہتے تھے اور اس کے ساتھ آواز بلند فرماتے تھے۔ اس حدیث کے بارے میں علامہ نیمویؒ فرماتے ہیں:

هو حدیث مضطرب قلت وجه الاضطراب انه روی من طریق سفیان عن وائل بن حجرؓ ان النبی ﷺ قال آمین رفع بها صوته اومثل ذلك ومن طریق شعبه اخفی بها صوته او نحو ذلك ولیس حدیث سفیان اصح من حدیث شعبه کما زعمه البخاری وابوزرعه وغیرهما بل کلاهما متساویان وسیجیٔ تحقیقه فی حدیث الخفض انشاء الله فاضطرب الحدیث فی الرفع والخفض......ولعل الامام البخاری مع شدة حرصه علی اثبات الجهر

بالتامين وصاحبه مسلما لم يخرجاه في صحيحيهما لهذه العلة.

(الله اعلم بالصواب)

ترجمہ: یہ مضطرب حدیث ہے میں کہتا ہوں کہ اضطراب کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث سفیان عن وائل بن حجر کے طریق سے مروی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے آمین کہا، اور اس کے ذریعہ اپنی آواز کو بلند فرمایا۔ یا اسی کے مثل مروی ہے، اور یہی حدیث طریق شعبہ سے مروی ہے، کہ نبی کریم ﷺ نے آمین کے ذریعہ اپنی آواز کو پست فرمایا۔ یا اسی کے مثل مروی ہے، اور حدیث سفیان حدیث شعبہ سے اصح نہیں ہے۔ جیسا کہ یہ امام بخاری اور ابوزرعہ وغیرہ کا خیال ہے بلکہ دونوں حدیث برابر درجے کی ہیں اور اس کی تحقیق انشاء اللہ آمین آہستہ کہنے کی حدیث کی بحث میں آئے گی۔ تو حاصل یہ ہوا کہ یہ حدیث مضطرب ہے۔ جہر اور سر کے درمیان۔ اسی علت کی وجہ سے شاید امام بخاری نے اثبات آمین بالجہر میں اپنی شدید رغبت کے باوجود اور اسی طرح سے امام مسلم نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس حدیث کو ذکر کرنے سے گریز کیا۔

آمین بالسر کے سلسلہ میں یہ دو صحیح حدیثیں بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔

عن الحسن عن سمرة بن جندب انه كان اذا صلى بهم سكت سكتين اذا فتح الصلاة واذا قال ولاالضالين سكت ايضًا هنيةً. فانكروا ذلك عليه فكتب الى ابى بن كعب فكتب اليهم ابى ان الامر كما صنع سمرة. (رواه احمد والدار قطني واسناده صحيح. آثار السنن: ص: ۹٦)

ترجمہ: حسن بصری سے مروی ہے کہ سمرۃ بن جندبؓ جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو دو سکتہ کرتے تھے، ایک نماز شروع کرنے کے وقت، دوسرا جب ولا الضالین کہہ لیتے تھے تو تھوڑا وقفہ فرماتے تھے، لوگوں نے اس پر انکار کیا، تو انہوں نے ابی بن کعب کے پاس اس صورت کو لکھا، تو انہوں نے جواب دیا مسئلہ وہی ہے جو سمرہ نے کہا۔

عن وائل بن حجر قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فلما قرأ غير المغضوب عليهم ولاالضالين قال آمين. واخفى بها صوته.

(رواه احمد والترمذي، وابوداؤد الطيالسي، والدار قطني والحاكم) وآخرون **واسناده صحيح وفي متنه اضطراب. وقال الحاكم في المستدرك**

هذا حديث صحيح على شرطهما اقره الذهبي.

ترجمہ: وائل بن حجر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی اور جب غیر المغضوب علیھم و لا الضالین پڑھا تو آمین کہا اور اس کے ذریعہ اپنی آواز کو پست رکھا۔

وجہ اضطراب شعبہ اور سفیان کی روایتوں کا اختلاف ہے لیکن شعبہ کی اس حدیث کی وجہ ترجیح امام نیموی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

وعندي وجه حسن لترجيح رواية شعبة على ماروا ه الثوري وهو ان شعبة لم يكن يدلّس لا من الضعفاء ولا عن الثقات . اما الثوري فكان ربما يدلِسُ وقد عنعنه. (آثار السنن: ص: ۹۷)

ترجمہ: میرے نزدیک شعبہؒ کی روایت کو سفیانؒ کی روایت پر ترجیح کی نفیس وجہ ہے، وہ یہ کہ شعبہ تدلیس نہیں کرتے تھے نہ تو ضعفاء سے اور نہ ہی ثقات سے اور رہے سفیان تو وہ کبھی کبھی تدلیس کر جاتے تھے اور ان کی یہ روایت معنعن ہے۔

لیکن قرآن و سنت کے برخلاف غیر مقلدین کا کہنا ہے، کہ آمین اونچی آواز سے کہنا سنت ہے جو شخص ان آیات احادیث اور آثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پیش نظر ان سے یہ کہے آہستہ آواز سے آمین کہو، تو وہ اسے تارک سنت سمجھ کر نہ صرف نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، بلکہ اسے بے نصیب نامراد حتی کہ یہودی تک کہہ گذرتے ہیں۔

چنانچہ جماعت غرباء اہل حدیث کے سابق امام مفتی عبدالستار صاحب لکھتے ہیں:

"پس آج کل جو بھی ناعاقبت اندیش فتنہ انگیز اونچی آمین سے چڑھے اور کہنے والوں سے حسد رکھے وہ یہودی ہے۔ (فتوی آمین بالجہر ص: ۳۴، بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص: ۳۸۶)

مولوی نور محمد گرجاکھی یوں گل افشانی کرتے ہیں:

"اے منکرین آمین اور آمین بالجہر سے روکنے والو! سوچو کہ تم کس قدر بے نصیب اور نامراد ہو بلکہ اوروں کو بھی اس نعمت سے نامراد اور بے نصیب کرتے ہو"۔ (اثبات آمین بالجہر، ص: ۱۳، بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص: ۳۸۷)

نماز کے اندر صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین

شروع شروع میں نبی کریم ﷺ تکبیر تحریمہ، میں رکوع میں جاتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت،

سجدہ میں جاتے وقت، نیز سجدے سے اٹھتے وقت، اور دو رکعت کے بعد قیام کے وقت، رفع یدین فرماتے تھے۔ بعد میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تمام موقعوں پر رفع یدین کرنا موقوف ہوگیا۔ چنانچہ سجدوں میں جاتے اور سجدوں سے اٹھتے وقت رفع یدین کے منسوخ ہونے کے سب ہی قائل ہیں فریق مخالف صرف رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنے پر اب بھی مصر ہے، جب کہ ہم کہتے ہیں، کہ جس طرح سجدوں میں رفع یدین پہلے تھا اب نہیں ہے اسی طرح رکوع میں بھی رفع یدین پہلے تھا اب منسوخ ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ترتیب وار دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

رکوع میں رفع یدین

عن عبداللّٰہ بن عمرؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا فتتح الصلوٰۃ و اذا کبر للرکوع و اذا رفع رأسہ من الرکوع رفعھما کذلک ایضًا وقال سمع اللّٰہ لمن حمدہ وربنا لک الحمد و کان لایفعل ذلک فی السجود. (رواہ الشیخان)

ترجمہ: عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ جب نماز شروع فرماتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو کندھوں کے برابر اٹھاتے تھے اور جب رکوع کی تکبیر کہتے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تب بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھاتے تھے۔

قال النیمویؒ وفی الباب عن ابی حمید نالساعدیؓ ومالک ابن الحویرثؓ ووائل ابن حجرؓ وعلیؓ وغیرھم من اصحاب النبی ﷺ (آثار السنن: ص: ۱۰۰)

ترجمہ: علامہ نیموی فرماتے ہیں کہ اس باب میں ابو حمید ساعدیؓ، مالک بن الحویرث، اور وائل بن حجر وعلی وغیرہم صحابہؓ سے احادیث منقول ہیں۔

دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین

عن نافع ان ابن عمر کان اذا دخل فی الصلوٰۃ کبر ورفع یدیہ و اذا رکع رفع و اذا قال سمع اللّٰہ لمن حمدہ رفع یدیہ و اذا قام من الرکعتین رفع یدیہ. رفع ذلک ابن عمر الی النبی ﷺ. (رواہ البخاری، بحوالہ آثار السنن: ص: ۱۰۱)

ترجمہ: نافع سے مروی ہے کہ ابن عمرؓ جب نماز میں داخل ہوتے تو تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھوں کو

اٹھاتے تھے اور رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھ کر سمع اللہ لمن حمدہ کہتے وقت اور دوسری رکعت سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے اور اس عمل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے تھے۔

سجدوں کے لیے رفع یدین

عن مالك بن الحويرث انه رأى النبى صلى الله عليه وسلم رفع يديه فى صلاته اذا ركع واذا رفع رأسه من الركوع واذا سجدواذا رفع رأسه من السجود حتى يحاذى بهما فروع اذنيه . (رواه النسائى واسناده صحيح وفى الباب عن انسؓ عن ابن عمرعن ابى هريرةؓ (آثار السنن:ص:۱۰۱)

ترجمہ: مالک بن الحویرث سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں رکوع کرتے وقت رکوع سے اٹھتے اور سجدے میں جاتے اور سجدے سے اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے، یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کو کانوں کے اوپری حصہ کے برابر کردیتے تھے۔

قال النيموى: لم يصب من جزم بانه .لايثبت شيء فى رفع اليدين للسجود.ومن ذهب الى نسخه فليس له دليل على ذلك الامثل دليل من قال لايرفع يديه فى غير تكبيرة الافتتاح. (آثار السنن:ص:۱۰۳)

ترجمہ: نیمویؒ کہتے ہیں ان لوگوں کا قول درست نہیں ہے، جو کہتے ہیں کہ سجدوں کے لیے رفع یدین کے سلسلہ میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے، اور جو حضرات اس رفع یدین کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں ان کے پاس اسی طرح کی دلیل ہے، جس طرح کی دلیل ان حضرات کے پاس ہے، جو کہتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا جائے گا۔

ابتداء میں ان تمام مواقع پر رفع یدین تھا لیکن بعد میں رکوع اور سجدے اور دو رکعت کے بعد قیام کے سلسلہ میں رفع یدین آیت کریمہ "قوموا للہ قانتین" سے منسوخ ہوگیا۔

اس کی دلیل مسلم شریف کی یہ روایت ہے:

حدثنا ابوبكر بن ابى شيبه وابو كريب قالا نامعاوية عن الاعمش عن المسيب بن رافع عن تميم بن طرفه عن جابر بن سمره قال خرج

علینا رسول اللّٰہ ﷺ فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانھا اذناب خیل شمس اُسکُنوا فی الصلاۃ (الحدیث)(صحیح مسلم: ج:۱، ص:۱۸۱،

ابو داؤد: ج:۱، ص:۱۴۳، نسائی: ج:۱، ص:۱۷۶)

ترجمہ: جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ ہمارے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فرمایا میں تمہیں اس طرح سے ہاتھ اٹھائے ہوئے کیوں پاتا ہوں جیسے بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمین اٹھی ہوئی ہوں نماز میں سکون اختیار کرو۔

اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف رفع یدین سے منع کر دیا اسی طرح ایک روایت میں جو عن عبید اللّٰہ بن القبطیہ عن جابر بن سمرۃؓ ہے سلام پھیرتے وقت ہاتھ اٹھانے کو منع فرمایا ہے اور وہاں وہی تشبیہ دی ہے۔ لیکن تمیم بن طرفہ کی روایت میں خرج علینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں اور عبید اللہ بن القبطیہ کی روایت میں کنا اذا صلینا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں پہلی روایت سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز میں شریک نہیں تھے دوسری روایت سے صحابہ کرام کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک ہونا ثابت ہوتا ہے بہر حال یہ دونوں حدیثیں الگ الگ ہیں، تشبیہوں کے اشتراک سے حدیثوں کا اشتراک ضروری نہیں۔ حدیث میں اسکنوا فی الصلاۃ کے الفاظ ہیں جس کے معنی نماز کے اندر رفع یدین ترک کرنا۔ چوں کہ تحریمہ کے وقت کا رفع یدین نماز سے قبل ہے اس لیے اس کے علاوہ بقیہ تمام مواقع پر نماز کے اندر رفع یدین ممنوع ہو گیا۔

حدثنا ھناد نا وکیع عن سفیان عن عاصم بن کلیب عن عبدالرحمن بن الاسود عن علقمہ قال قال عبداللّٰہ بن مسعود الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللّٰہ ﷺ؟ فصلی بھم فلم یرفع یدیہ إلا فی اوّل مرۃ وفی الباب عن البراء بن عازب قال ابوعیسیٰ حدیث ابن مسعود حدیث حسن وبہ یقول غیر واحد من اھلم العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعین وھو قول سفیان واھل الکوفۃ. (جامع ترمذی: ج:۱، ص:۵۹. رجالہ رجال مسلم.

قال النیمویؒ رواہ الثلاثہ وھو حدیث صحیحٌ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے لوگوں سے کہا میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہ

پڑھاؤں؟ پھر انہوں نے نماز پڑھائی اور پہلی دفعہ کے علاوہ پوری نماز میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔

عن سالم عن ابیه قال رأیت رسول اللّٰه ﷺ اذا افتتح الصلوٰة رفع یدیه حتی یحاذی بهما وقال بعضهم حذو منکبیه واذا اراد ان یرکع وبعد مایرفع رأسه من الرکوع لا یرفعهما وقال بعضهم لایرفع بین السجدتین "والمعنی واحدٌ" (صحیح ابوعوانہ: ج:۲،ص:۹۰)

ترجمہ: حضرت سالم اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ نماز شروع فرماتے تو رفع یدین کرتے مونڈھوں تک اور جب رکوع کرنے کا ارادہ فرماتے اور رکوع سے سر مبارک اٹھانے کے بعد رفع یدین نہیں فرماتے تھے۔ اور بعض راویوں نے کہا کہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے، سب راویوں کی روایت کا معنی ایک ہے (مگر الفاظ مختلف ہیں)

اسی طرح تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور مواقع میں رفع یدین کے منسوخ ہونے کی اہم ترین دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث رفع یدین کے مرکزی اور بنیادی راوی ابن عمرؓ کا عمل بھی ان کی روایت کے خلاف ہے وہ بھی صرف پہلی دفعہ ہی رفع یدین کرتے تھے۔ جو بقیہ مواقع میں رفع یدین کے منسوخ ہونے کی بین دلیل ہے۔ اس لیے کہ ابن عمرؓ جیسے عاشق ادائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا تصور بھی محال ہے، کہ وہ جان بوجھ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل کے خلاف کریں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ تحریر فرماتے ہیں:

لانه محال ان یکونُ عنده فی ذٰلك عن النبی ﷺ شیئ ویخالفه ولوکان مباحًا ولا سیما ابن عمرؓ. (التمہید: ج:۹،ص:۱۸۰)

ترجمہ: اس لیے کہ محال ہے کہ ان کے پاس حضور ﷺ کا کوئی عمل ہو اور وہ اس کی مخالفت کریں چاہے وہ عمل مباح ہی ہو خصوصاً ابن عمرؓ سے تو اور بھی بعید ہے۔

ان روایات میں ابن عمرؓ کا عمل دیکھیے:

حدثنا ابوبکر بن عیاش عن حصین عن مجاهد قال مارأیت ابن عمرؓ یرفع یدیه الافی اوّل مایفتتح. (مصنف ابن ابی شیبہ: ج:۱،ص:۲۶۸، رجال اسنادہ رجال البخاری)

ترجمہ: مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو اوّل افتتاح کے علاوہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔

عن مجاهد قال صليت خلف ابن عمرؓ فلم يكن يرفع يديه الا فى التكبيرة الاولىٰ. (شرح معانی الآثار: ج:۱، ص:۱۳۳، وقال العينى اسناده صحيحٌ. عمدة القارى: ج:۵، ص:۲۷۳)

ترجمہ: مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی وہ تکبیر اولیٰ کے علاوہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح خلفائے راشدین میں حضرت ابوبکر حضرت عمر حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل صحیح سندوں سے یہی ثابت ہے کہ وہ صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے تھے خلفائے راشدین سے بڑھ کر حضور ﷺ کے عمل کو کون جاننے والا اور دیکھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا ہوسکتا ہے۔

قال النيمویؒ: الصحابة رضى الله عنهم و من بعدهم مختلفون فى هذا الباب و اما الخلفاء الاربعة فلم يثبت عنهم رفع الايدى فى غير تكبيرة الاحرام. (والله اعلم بالصواب) (آثار السنن: ج:۱، ص:۱۰۹)

ترجمہ: نیمویؒ نے کہا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد والے اس باب میں اختلاف رکھتے ہیں لیکن خلفائے راشدینؓ سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین ثابت نہیں ہے۔

تعامل خلفائے راشدین بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کے برخلاف غیر مقلد حضرات کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اخیر تک رہا۔ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ اور اس سلسلہ میں جس حدیث سے استدلال کرتے وہ بالکل موضوع ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

عن ابن عمرؓ ان رسول الله ﷺ كان اذا فتتح الصلوٰة رفع يديه، واذاركع واذا رفع رأسه من الركوع وكان لايفعل ذٰلك فى السجودفما زالت تلك صلواته حتى لقى الله تعالىٰ (رواه البيقهى وهو حديث ضعيف بل موضوع) (آثار السنن: ص:۱۰۱، ج:۱)

ترجمہ: ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع فرماتے اور جب رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین کرتے اور سجدے میں یہ عمل نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ کی اللہ تعالیٰ کے یہاں جانے تک اسی طرح نماز رہی۔

اس حدیث کے راویوں میں عبدالرحمٰن بن قریش اور عصمۃ بن محمد الانصاری ہیں اور یہ دونوں راوی وضّاع اور کذاب ہیں۔ (ملاحظہ ہو نصب الرایہ: ص:۴۱۰، ج:۱)

عجیب جسارت ہے کہ اپنے مطلب کی بات کے لیے موضوع روایتوں کا سہارا لینے سے بھی پاک نہیں ہے اور اپنے مطلب کے خلاف ہو تو صحیح روایتوں کو بھی ضعیف کہہ دینے میں کوئی خوف نہیں ہوتا یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ ایک صاحب نے اس موضوع حدیث کی جھوٹے راویوں والی سند ہٹا کر بخاریؒ و مسلمؒ کی سند لگادی بددیانتی خیانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پورے منصوبہ بندی کے ساتھ جھوٹ باندھنے کی اس سے بھیانک مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

چنانچہ مولوی نور حسین گرجاکھی غیر مقلد لکھتے ہیں:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وفات تک رفع یدین کرنا''

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يرفع يديه اذا افتتح الصلاة واذا كبر للركوع واذا رفع رأسه من الركوع فمازالت تلك صلاته حتى لقى الله تعالىٰ.

سبحان اللہ یہ کیسی پیاری اور عمدہ حدیث ہے جس کو چھیالیس ائمہ نے نقل کیا ہے، اور اس کا اسناد کتنا عمدہ۔ (۱) امام مالک تو وہ تمام عالموں اور محدثوں کے پیشوا ہیں اور وہ اس کو (۲) ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جو اہل مدینہ کے بڑے مشہور عالم اور امام تھے اور امام زہری (۳) سالم ابن عبداللہ سے روایت کرتے ہیں جو بڑے تابعی اور فقیہ ہیں، اور سالم حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ جو بڑے قدیم الاسلام متبع سنت اور بڑے درجے والے ہیں۔ (قرۃ العینین فی اثبات رفع الیدین: ص: ۹۰۸)

جن لوگوں کے نزدیک رفع یدین ترک ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ افضیلت ترک ہوئی اصل جواز باقی ہے اور دوسروں کے نزدیک افضیلت باقی ہے اسے واجب تو کسی نے نہیں کہا اور نہ ہی وہ کبھی واجب رہا۔ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی واجب نہیں ثابت کیا جا سکتا ہے۔

لیکن مولوی نور حسین گرجاکھی اپنے فرقہ کی ترجمانی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''رفع یدین سنت مؤکدہ بلکہ واجب ہے اور اس کے چھوڑنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔

(قرۃ العینین: ص: ۶۹)

غیر مقلدین کے مناظر اسلام عبدالقادر صاحب روپڑی فرماتے ہیں۔

''جو شخص اس سنت کا تارک ہو وہ سخت گنہگار ہے''۔ (بحوالہ حدیث اور اہل حدیث: ص: ۴۲۶)

اہلِ نظر ذرا غور فرمائیں! کہ ان لوگوں کے ان بے محابا فتوؤں کی زد میں کون کون آرہا ہے کیوں کہ خلفائے ثلاثہ (چوں کہ حضرت عثمانؓ سے رفع اور عدم رفع کچھ بھی منقول نہیں ہے)

اور عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت براء بن عازبؓ حضرت عبادؓ اور بے شمار صحابہ کرامؓ فقہائے کوفہ۔ اور تمام عالم کے بیشتر مسلمان رفع یدین نہیں کرتے تو سب کی نمازیں معاذ اللہ باطل ہوئیں سب تارک سنت اور سخت گناہ گار ہوئے۔ ع

ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں

نماز وتر واجب ہے

(۱) عن عبداللّٰہ بن عمرؓ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اجعلوا آخر صلواتکم باللیل وتراً. (بخاری شریف: ص:۱۳۶، ج:۱، مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۵۷)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی رات کی نمازوں کے آخر کو وتر بناؤ۔

(۲) وعنہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: بادرُوا الصبح بالوتر.

(مسلم شریف: ج:۱، ص:۲۵۷)

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے صبح سے پہلے وتر پڑھ لو!

(۳) عن جابرؓ قال: قال: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من خاف ان لایقوم من آخر اللیل، فلیوتر اوّلہ ومن طمع ان یقوم آخرہ، فلیوتر آخر اللیل —فان صلوٰۃ آخر اللیل مشھودۃ—وذٰلک افضل.

(مسلم شریف: ص:۲۵۸۔ ج:۱)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو یہ ڈر ہو کہ وہ آخرِ شب میں نہیں اٹھ سکتا تو اسے چاہیے کہ رات کے شروع ہی میں وتر پڑھ لے۔ اور جسے آخر شب میں اٹھنے کی امید ہو تو اسے چاہیے کہ آخر شب میں ہی وتر پڑھے۔ اس لیے کہ آخر شب کی نماز ملائکہ رحمت کے نزول کا وقت ہے اور یہ افضل وقت ہے۔

(۴) عن بُرَیدَۃؓ قال: سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول: الوتر حقٌ. فمن لم یوتر فلیس منا— الوتر حق. فمن لم یوتر فلیس منا—

الوتر حق. فمن لم یوتر فلیس منا. (ابوداؤدشریف: ج:۱،ص:۲۰۱۔ وقال النیموی اسنادہ حسن)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ وتر حق ہے جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں (اس بات کو آپ ﷺ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا)

(۵) وعن ابی سعید ن الخدریؓ قال: قال: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اِنّ اللّٰہ زادکم صلوٰۃ، وھی الوتر. (رواہ البطرانی فی مسند الشامیین

قال الحافظ فی الدرایۃ باسناد حسن الدرایۃ، ص: ۱۸۹، ج: ۱، کتاب الصلوٰۃ)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک اور نماز بڑھادی ہے اور وہ وتر ہے۔

ان احادیث اور ان کے علاوہ اور بہت سی احادیث کے پیش نظر امت کے بہت سے علماء (جن میں صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہؓ اور تابعین عظامؒ مثلاً ابراہیم نخعیؒ اور سعید ابن مسیبؒ وغیرہ شامل ہیں) وتر کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ اور یہی رائے امام ابوحنیفہؒ کی بھی ہے۔ (ملاحظہ ہو: آثار السنن مع التعلیق الحسن: ص:۲۹۹، ۳۰۰، ج:۱، مکتبہ مدنیہ دیوبند)

معارف السنن میں ہے:

ومن الادلۃ انہ لم یثبت انہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ترك الوتر حضرًا. ولا سفراً، بل لم یثبت ذٰلك من الصحابۃ والتابعین، وھٰذا القدر یکفی دلیلاً للوجوب وقال مالك: من ترکہ ادب وکانت جرحۃ فی شھادتہ احکاہ ابن حزم عنہ کما فی العمدۃ.

(ص:۴۱۲، ج:۳) (معارف السنن: ص:۱۷۸، ج:۴)

ترجمہ: وتر کے وجوب کے دلائل میں سے یہ بھی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر اور حضر کسی بھی حالت میں وتر کا ترک کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ سے بھی وتر کا ترک کرنا ثابت نہیں ہے اور یہ چیز وجوب کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ حضرت امام مالکؒ نے کہا ہے کہ جو وتر ترک کرے گا۔ اس کی سرزنش کی جائے گی اور یہ چیز اس کی شہادت مجروح کردے گی۔ ان کی اس بات کو علامہ ابن حزمؒ نے نقل کیا ہے جیسا کہ عمدۃ القاری میں لکھا ہے۔

لیکن نصوص کی ان تاکیدوں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس شدتِ اہتمام کے باوجود غیر مقلدین کا کہنا ہے کہ وتر واجب نہیں ہے۔ جناب نواب نور الحسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

"وتر حق است بر ہر مسلم، لیکن واجب نیست۔ معہذا قضاء آں ثابت است"۔

ترجمہ: وتر حق ہے ہر مسلمان پر لیکن واجب نہیں۔ ہاں اس کی قضا ثابت ہے۔

وتر کی تین رکعتیں ایک ہی سلام سے ثابت ہیں

مذکورہ بالا احادیث سے واضح ہوا کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ مبارک میں نماز وتر کی بڑی اہمیت تھی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بڑا اہتمام تھا۔ باوجودیکہ وتر کا افضل وقت رات کا آخری حصہ ہے لیکن بیدار نہ ہوسکنے کی وجہ سے کہ کہیں یہ نماز فوت نہ ہوجائے اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم دیتے تھے کہ نماز عشاء کے بعد ہی وتر پڑھ لی جائے جیسا کہ حضرت جابرؓ سے مروی مسلم شریف کی روایت میں یہ حکم موجود ہے۔ اور یہی حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابوالدرداء حضرت ابوذرؓ کو دیا تھا (جیسا کہ بخاری مسلم اور نسائی میں علی الترتیب روایتیں موجود ہیں)

چنانچہ کسی عذر کی بناء پر کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رات کے شروع یا درمیان میں نماز وتر پڑھ لیتے تھے۔ ورنہ عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر رات کے آخری حصہ میں تہجد کے بعد ہی پڑھتے تھے جیسا کہ ترمذی شریف میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

"من کل لیل قداوتر. اوله، واوسطه، وآخره، فانتهی وتره حین مات فی وجه السحر" (ترمذی شریف: مع معارف السنن: ص: ۱۸۴، ج: ۴)

ترجمہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے رات کے اوّل درمیانی اور آخری تمام حصوں میں نماز وتر پڑھی اور وصال کے قریب تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وتر آخر شب میں ہی ہوتی تھی۔

نماز وتر کے سلسلہ میں وارد تمام احادیث پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے، کہ جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وتر کو بیان کیا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کے بعد پڑھی تو ان حضرات نے رکعتوں کی تعداد تین اور تینوں ایک ہی سلام سے بیان کی ہے (جیسا کہ آئندہ صفحات میں انشاء اللہ ہم ان روایتوں کو ذکر کریں گے)

اور جن حضرات ؒ نے آخرِ شب میں وتر پڑھنے کی روایتیں بیان کی ہیں، تو ان حضرات نے تہجد اور وتر دونوں پر تغلیباً وتر ہی کا اطلاق کر دیا ہے، اور تہجد کو وتر کے ساتھ شامل کر کے دونوں کی رکعتوں کو ایک ہی ساتھ بیان کر دیا ہے چوں کہ تہجد کی رکعات متعین نہیں ہیں اس لیے وہ حضرات کبھی پانچ کبھی سات، کبھی نو کبھی گیارہ، اور کبھی تیرہ بیان کر دیتے ہیں۔ اور اس کی حقیقت یہی ہوتی ہے کہ آخر کی تین وتر اور پہلے کی سب تہجد ہوتی ہیں۔ حضرت امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔

وقد روی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم "الوتر بثلاث عشرۃ، واحدی عشرۃ، وتسع سبع، وخمس، وثلاث، وواحدۃ قال اسحاق بن ابراھیم معنی ماروی "ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یوتر بثلاث عشرۃ" انما معناہ انہ کا یُصَلّی من اللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ مع الوتر فنسبت صلوٰۃ اللیل الی الوتر".

(ترمذی مع معارف السنن: ص: ۸۶-۱۸۵، ج: ۴)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر تیرہ، اگیارہ، نو، سات، پانچ تین اور ایک رکعتیں مروی ہیں۔ اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تیرہ رکعات وتر پڑھنا مروی ہے۔ تو اسکا معنی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں وتر سمیت تیرہ رکعات پڑھتے تھے تو تہجد کو بھی وتر کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔

اسحاق ابن ابراہیمؒ نے جو توجیہ تیرہ رکعات کے سلسلے میں بیان کی ہے وہی توجیہ اگیارہ، نو، سات اور پانچ رکعات کے بارے میں بھی کی جائے گی۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

"انبئینی عن وتر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالت: کنا نعدّلہ سوا کہ وطھورہ فیبعثہ اللّٰہ ماشاء ان یبعثہٗ من اللیل فیتسوّک ویتوضأ ویصلی تسع رکعات– لایجلس فیھا إلا فی الثامنۃ– فیذکر اللّٰہ ویدعوا ویحمدہٗ ثم ینھض ولا یُسلم ثم یقوم فیصلی التاسعۃ ثم یقعد فیذکر اللّٰہ ویحمدہٗ ویدعوہ ثم یسلم تسلیماً. (باب صلوٰۃ اللیل: ص: ۲۵۶۔ ج: ۱)

ترجمہ: راوی نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا، کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وتر کے بارے میں ہمیں مطلع فرمائیں۔ تو انھوں نے فرمایا: کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسواک اور وضو کا پانی تیار

رکھتے تھے۔ پھر جب اللہ کی مرضی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوتے تھے، اور مسواک اور وضو سے فارغ ہو کر نو رکعتیں پڑھتے تھے، جس میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ فرماتے تھے۔ پھر اللہ کے ذکر حمد اور دعا کے بعد بغیر سلام پھیرے اٹھتے تھے اور نویں رکعت پڑھتے تھے پھر قعدہ فرما کر اللہ کا ذکر حمد اور دعا کرتے اور اس کے بعد سلام پھیرتے تھے اس حدیث کی واضح تشریح یہی ہے کہ اس میں ابتداء کی چھ رکعتیں تہجد ہیں اور آخر کی تین وتر ہیں۔ جن میں ابتداء کی دو رکعتوں کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قعدہ تو فرمایا لیکن سلام نہیں پھیرا۔ اور آخری رکعت پر سلام پھیرا۔ چوں کہ سائل نے ان سے تہجد کی تفصیلات نہیں دریافت کی تھی اس لیے حضرت عائشہؓ نے اس کی تفصیل نہیں ذکر فرمائی۔ رہا ساری رکعتوں پر وتر کا اطلاق تو یہ تغلیباً ہے جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔

علامہ بدرالدین عینیؒ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"هذا اقتصار منها على بيان جلوس الوتر وسلامه. لان السائل انما سأل عن حقيقة الوتر ولم يسأل عن غيره فاجابت مُبِيِّنَةً بما فى الوتر من الجلوس على الثانية بدون سلام والجلوس على الثالثة بسلام. وهٰذاعين مذهب ابى حنفية. وسكتت عن جلوس الركعات التى قبلها وعن السلام فيها كما ان السوال لم يقع عنها فجوا بها قدطابق السوال، غير انها اطلقت على الجميع وتراً فى الصورتين لكون الوتر فيها. (عمدۃ القاری: ص: ۳۰۸-۳۰۹، ج: ۳ بحوالہ معارف السنن: ص: ۱۱۸، ج: ۴)

ترجمہ: اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے وتر کے جلوس اور سلام کے بیان پر اکتفاء کیا اس لیے کہ سائل نے وتر ہی کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ تو انھوں نے وتر کی دوسری رکعت کے جلوس بغیر سلام اور تیسری رکعت کے جلوس اور سلام کو بیان کیا۔ یہی بعینہٖ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اور انھوں نے وتر کے قبل کی رکعات کے جلوس کا کوئی ذکر نہیں کیا اس لیے کہ اس کے بارے میں سوال ہی نہیں تھا۔ تو ان کا جواب سوال کے مطابق ہے۔ مگر انھوں نے ساری رکعتوں پر صورتاً وتر کا لفظ اطلاق فرمایا کیوں کہ ان میں وتر داخل تھی۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے فرمایا کہ علامہ عینیؒ کی توجیح صحیح ہے امام طحاویؒ نے بھی شرح معانی الآثار میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ کی یہی روایت امام نسائیؒ نے ذکر کی ہے۔

جس کے الفاظ یہ ہیں:

"عن عائشةؓ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان لایسلم فی رکعتی الوتر"

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں میں **سلام نہیں پھیرتے تھے**۔ (سنن النسائی باب کیف الوتر بسلام: ص: ۲۴۸، ج: ۱)

اس حدیث کے بارے میں علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں **سند الحدیث فی غایة القوة"**

ترجمہ: اس حدیث کی سند انتہائی قوی ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو معارف السنن: ص: ۱۸۸، ج: ۴)

اس حدیث سے علامہ عینیؒ وغیرہ کی تشریح اظہر من الشمس ہوگئی اور چوں کہ آخری رکعت سابقہ رکعات سے الگ انداز پر ہوتی ہے اس لیے بعض دفعہ مجازاً صرف اسی پر وتر کا اطلاق کر دیتے ہیں جیسا کہ ابن عباسؓ کی اس روایت سے اِس بات کی وضاحت ہوتی ہے فرماتے ہیں:

"ثم رکعتین ثم اوتر" (بحوالہ: معارف السنن: ص: ۲۱۶، ج: ۱)

پورے ذخیرہ احادیث میں کسی بھی روایت سے صراحتاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ ابن صلاحؒ فرماتے ہیں:

لانعلم فی روایات الوتر مع کثرتها انه علیه السلام اوتر بواحدة فحسب" (حکاه ابن الحجر فی التلخیص: ص: ۱۱۶. بحواله معارف السنن: ص: ۲۱۵. ج: ۲)

ترجمہ: وتر کی روایات کی کثرت کے باوجود ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی رکعت وتر پڑھی ہو۔

صحیحین وغیرہ میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ:

"صلی رکعة واحدة توتر له ماقد صلی"

ترجمہ: ایک رکعت پڑھے جو گذشتہ رکعتوں کو وتر بنا دے گی۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے وہ رکعت تنہا وتر نہیں ہے۔ ہاں وہ اپنی ماقبل کی رکعتوں سمیت وتر بن جائے گی۔ علامہ نیمویؒ فرماتے ہیں:

"فیحتمل ان یرید بقوله صلی رکعة واحدة ای مضافة الی رکعتین

مما مضیٰ. (التعلیق الحسن: ص: ۳۰۷. ج: ۱)

ترجمہ: یہ بھی احتمال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک "صلی رکعة واحدة" سے مراد یہ ہو کہ وہ اپنے ماقبل کی دو رکعتوں سے ملی ہوئی ہو۔ بلکہ تین رکعات والی روایتوں سے اسی معنی کی صراحتاً تاکید ہوتی ہے۔ ایک رکعت وتر کی نفی اور تین رکعت کا ثبوت۔ بیہقی وغیرہ کی اس روایت سے بخوبی ہوتا ہے:

عن ابی هریرةؓ عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: لا توتروا بثلاث اَوْ تِروا بخمس،اوبسبع. ولاتشبّهوا بصلوٰة المغرب.

(دارقطنی: ج: ۲،ص: ۲۴. سنن الکبری للبیهقی: ج: ۳،ص: ۳۱. اسناده حسنٌ)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین رکعت کے ذریعہ وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات رکعات کے ذریعہ وتر پڑھو اور مغرب کی نماز کے ساتھ مشابہت مت اختیار کرو۔

یہ حدیث اس سلسلہ میں واضح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن مبارک میں وتر تین ہی رکعت ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے ہیں کہ لوگ صرف وتر پر اکتفاء کر کے اسے مغرب کی طرح نہ بنادیں بلکہ اس سے پہلے دو چار رکعت تہجد بھی پڑھ لیا کریں۔

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں:

"ان الحدیث یدل علی ان لاوتر هناك فی ذهن الشارع اقل من ثلاث، وانه یُریدان لایقتصروا علیه فیتر کوا صلوٰة اللیل رأسًا. (معارف السنن، ص: ۲۲۱۔ ج: ۴)

ترجمہ: یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ذہن مبارک میں یہی ہے کہ وتر تین رکعات سے کم نہیں ہے لیکن آپ ﷺ چاہتے ہیں کہ لوگ اسی پر اکتفاء کر کے تہجد ترک نہ کردیں۔

نیز یہ حدیث ایک رکعت وتر کی نفی کرتی ہے:

"فی ذٰلك نفی الایتار برکعة واحدة" (تقریب شرح معانی الآثار: ج: ۱، ص: ۲۷۳)

ترجمہ: اس حدیث میں ایک رکعت وتر کی نفی ہے۔

اب یہاں ہم چند روایات ذکر کرتے ہیں جن سے صراحتہً وتر کی تین رکعات کا ایک سلام سے ثبوت ہوتا ہے۔

(۱) "عن ابی سلمة بن عبدالرحمن انه اخبرهٗ انه سأل عائشةؓ کیف کانت صلوٰة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی رمضان؟ فقالت:

ماكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يزيد فى رمضان ولا فى غيره على احدى عشر ركعة يصلى اربعًا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن، ثم يصلى اربعًا فلا تسئل عن حسنهن وطولهن ثم يصلى ثلاثًا.

(بخاری:ص: ۱۵٤. ج:۱. مسلم:ص: ۲۵٤. ج:۱)

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ نہ پوچھو! کہ وہ کتنی حسین وطویل ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعتیں پڑھتے تھے ان کے بھی حسین وطویل ہونے کے بارے میں کچھ نہ پوچھو! پھر تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔

(۲) عن سعد بن هشام ان عائشةؓ حدثته ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان لايسلم فى ركعتى الوتر. (رواہ النسائی: ج:۱،ص:۲۴۸ وآخرون واسنادہ صحیح)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

(۳) روى عن ابن عباسؓ حديث طويل فى آخره ثم اوتر بثلاث"

(مسلم:ص:۲۶۱. ج:۱)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کی طویل حدیث کے آخیر میں ہے پھر نبی کریم ﷺ نے تین رکعات وتر پڑھی۔

عن عائشةؓ قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث لايُسلم الافى آخرهن. (رواه الحاكم فى المستدرك :ص: ۳۰٤. ج:۱. وقال انه صحيحٌ على شرط البخارى ومسلم)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر پڑھتے تھے اور آخر ہی میں سلام پھیرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ سے ایک ہی سلام کے ذریعہ وتر کی تینوں رکعتیں پڑھنے کے اس صاف اور صریح ثبوت کے بعد غیر مقلدوں کی یہ جسارت بے جا دیکھیے! نواب نورالحسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

"حدیث ایتار بسہ رکعت ضعیف بلکہ غیر ثابت است بلکہ ازاں نہی آمدہ است پس احتیاط

در ترک ایتار بسہ رکعت ست"۔ (عرف الجادی: ص: ۳۳)

ترجمہ: تین رکعات وتر پڑھنے کی حدیث ضعیف ہے بلکہ ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے ممانعت آئی ہے پس احتیاط اس میں ہے کہ تین رکعات نہ پڑھیں۔ نواب وحید الزماں صاحب لکھتے ہیں:

"اما الوتر بثلاث رکعات مع تشهدين وسلام واحدٍ. كما هو مذهب الاحناف منهي عنه لئلا يتشبه النفل بالفرض. اى صلاة المغرب .

ترجمہ: رہیں تین رکعات وتر۔ دو تشہدوں اور ایک سلام کے ساتھ۔ جیسا کہ احناف کا مذہب ہے۔ تو اس سے منع کیا گیا ہے تا کہ نفل فرض یعنی مغرب کے مشابہ نہ ہو جائے۔ صحیح اور صریح روایات سے ثابت شدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل مبارک کو "منہی عنہ" یعنی حرام قرار دینے کو جسارت اور جہالت کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اللّٰهم احفظنا من شرورر انفسنا ومن سيئات اعمالنا

Pentone 9897869314

مکتبہ دارالعلوم دیوبند

MAKTABA DARUL-ULOOM

DEOBAND-247554 (U.P.)INDIA